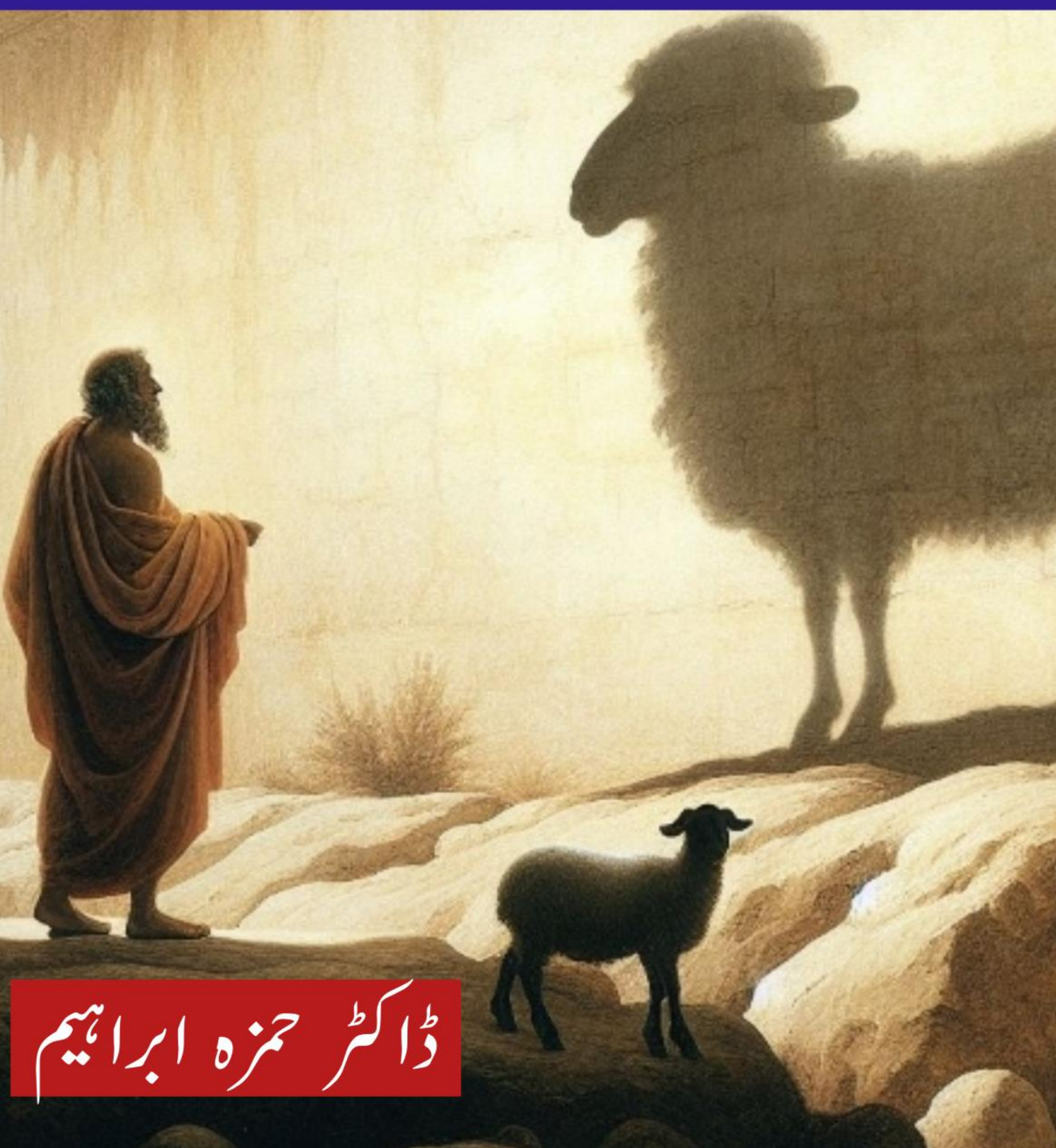
ملا صدرا کے فلسفے کا مطالعہ



ڈاکٹر حمزہ ابراہیم

ملا صدرا کے فلسفے کا مطالعہ

(نظرِ ثانی شدہ)

ڈاکٹر حمزہ ابراہیم



فہرست

مقدمہ

یہ کتاب کچھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ملا صدرا کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے لکھے گئے تھے۔ اپنے لیے لکھے گئے یہ مضامین حرفِ آخر نہیں، نہ ہی یہ مکمل ہیں۔ انسان وقت کے ساتھ سیکھتا رہتا ہے۔ ابھی بہت سے موضوعات کا جائزہ لینا باقی ہے لیکن اس کے لیے وقت میسر نہیں ہو سکا۔ دلی آرزو ہے کہ یہ اس فلسفے کو ایک اور زاویئے سے دیکھنے میں مدد کریں اور پڑھے لکھے افراد ان موضوعات پر مزید کام کریں اور ان کی تحقیقات سے مجھے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی ملے۔ ان تحریروں میں خامیاں بھی ہوں گی مگر ان کا درست حل جدید علوم سے آگاہی کے بنا نکالنا ممکن نہ ہو گا۔ یہاں مقدمے کے طور پر مندرجہ ذیل باتوں کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔

عقل کیا ہے؟

جسمانی حسیات تو جانوروں میں بھی ہیں لیکن انسانوں کے پاس گفتگو کے ذریعے ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔[1] یہ عقل ہے،

---

[1] فَبَشِّرْ عِبادِ . الَّذینَ یَسْتَمِعونَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعونَ أَحْسَنَهُ أُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ہَدٰىہُمُ اللّٰہُ وَ أُولٰئِکَ ہُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ .

ترجمہ: ''آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے، جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔'' (سورہ زمر، آیات 17، 18۔)

جس سے مراد حسِ مشترک (common sense) ہے۔اسے چھٹی حس بھی کہتے ہیں۔ یہ زبان کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔ زبان کے درست استعمال سے ہی انسان دوسروں کے تجربے اور علم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور دوسرے لوگ اس کے علم کو پرکھ سکتے ہیں۔ خواب اور بیداری میں عقل ہی کا فرق ہے، کسی کو خواب میں پیش آنے والی صورتحال کا کوئی اور شخص تجربہ و تجزیہ نہیں کر سکتا۔ علم واقعیت کے ایسے بیان کو کہتے ہیں جس کی پیش گوئی کو کوئی اور شخص بھی دہرا سکے۔ ہمارا علم صرف الفاظ و اعداد کی شکل میں ہی ہوتا ہے۔

انسان زبان کی مدد سے ہی سماج کا حصہ بنتا ہے۔ ہر فرد اسی حد تک سماج کا حصہ ہے جس حد تک سماج اسے سنتا ہے۔ چنانچہ ایسے معاشرے جن میں عدم برداشت ہو، وہاں لوگوں کی عقل کم ہو جاتی ہے اور علمی پیشرفت نہیں ہوتی۔ وہاں علم کی کمی سے معیشت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ عقلِ سلیم اصل میں حسِ مشترک کے سالم ہونے کا ہی نام ہے۔ عقل کے بارے میں صوفیانہ نظریات جہالت پر مبنی ہیں۔ عقل کا یونانی تصوراب فلسفے میں بھی کانٹ Kant(متوفی1804ء) کی کتاب ''تنقیدِ عقلِ محض (critique of pure reason)'' کے بعد متروک ہو چکا ہے۔[1]

---

[1] کانٹ کے فلسفے سے آشنائی کیلئے کارل یاسپرس کی اس مختصر کتاب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔
Kant by Karl Jaspers.

عقل فکر کرنے کے درست طریقے کا نام ہے۔ عقل کا تعلق دماغ کی ساخت سے بھی ہے۔ انسانی دماغ انہی تصورات کا مکمل احاطہ کر سکتا ہے اور ان کو بیان کر سکتا ہے جو عدد میں قید ہو سکیں۔ انسانی دماغ میں فکر کا عمل الفاظ کی مدد سے ہوتا ہے اور الفاظ کی بنیادوں میں اعداد ہوتے ہیں جو خلیوں کی برقی ترکیب سے وجود پاتے ہیں۔ الفاظ اور تصویروں کو اعداد سے وہی نسبت ہے جو مالیکیولز کو ایٹمز سے ہے۔ پیچیدہ حیاتیاتی نظام مالیکیولز سے ترتیب پاتا ہے اور خیالات الفاظ سے، الفاظ کے درست استعمال کے بغیر درست ابلاغ ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ سب سے واضح تبادلۂ خیال ریاضی کی زبان میں ہوتا ہے۔ اسی لیے سائنس صرف ان چیزوں کے بارے مکمل علم حاصل کر سکتی ہے جن کو عدد کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ الفاظ کی شکل میں جو نظریات بیان کئے جائیں ان میں ہمیشہ تفسیر کی گنجائش رہتی ہے۔

انسان شناسی میں عدم قطعیت

لوگ یوں تو مالیکیولز کی ایک نہایت پیچیدہ ترکیب سے مل کر بنے ہوتے ہیں، لیکن یہ تراکیب جہاں باہم مماثلتیں رکھتی ہیں وہیں لاتعداد فرق بھی رکھتی ہیں۔ ہر فرد مختلف ماضی رکھتا ہے، حال میں صورتحال سے دوچار ہوتا ہے، اور مستقبل کے لیے مختلف خواب رکھتا ہے، جس سے وہ دوسروں سے الگ ہو جاتا ہے۔ کوئی دو انسان پیدائش کے وقت بھی ہو بہو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اگر دیکھا جائے تو وہ پیچیدہ چیزیں جو ابتداء میں ایک جیسی ہوتی ہیں، جیسے ایک ہی ماڈل کے لیپ ٹاپ، وہ بھی مختلف جگہوں پر جا کر مختلف حالات کا شکار ہونے کی وجہ سے کچھ ماہ بعد ہی کافی حد تک مختلف ہو چکی ہوتی ہیں۔

اس نکتے کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں کے بارے مکمل معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ سچائی تو ایک ہی ہے، لیکن اس کا مکمل احاطہ کسی فرد کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ہم صرف یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا جھوٹ ہے، لیکن سچ کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے۔ البتہ ممکن حد تک معلومات اکٹھی کر کے کچھ فلسفیانہ خیالات ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔

فلسفہ علم نہیں ہوتا، بلکہ جن مسائل میں قطعی علم تک پہنچنا مشکل ہو ان کے بارے میں غلط فیصلے کرنے سے بچنے کی کوشش ہے۔ فلسفہ زبان کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ ہے، فلسفہ بھی ادب کا ہی حصہ ہے۔ زبانیں علوم کو ٹھیک سے نہیں سمو سکتیں، لہٰذا انسانوں کی ماہیت کے پیچیدہ ہونے کے علاوہ زبان کی محدودیتیں بھی فلسفے میں غلطیوں کا ایک اور سبب ہیں۔ یہاں سے فلسفے کی عدم قطعیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس عدم قطعیت کا کوانٹم فزکس کی تکوینی عدم قطعیت سے کوئی تعلق نہیں، جس کی دقیق پیمائش ممکن ہے۔

فلسفہ زبان کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ ہے، فلسفہ بھی ادب کا ہی حصہ ہے۔ اسلیے جو فلسفہ جتنا جاہلانہ ہوتا ہے اتنا ہی اس میں مشکل اور مبہم اصطلاحات کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور وہ زبان کو اپنی بنیادی ترین صفت، یعنی ابلاغ، سے محروم کرتا ہے۔ اچھا فلسفہ وہی ہے جو گہرے معنوں کو ہر ممکن سادہ الفاظ میں افکار کے میدان میں پہنچا سکے۔ بعض اوقات معنوی طور پر سطحی اور پوچ مطالب کو پیچیدہ لفاظی کی زرہ پہنا کر میدان میں اتارا جاتا ہے۔ الفاظ مشکل اور جملے آسان ہوں تو یہ کھوکھلے پن کی علامت ہے۔ اس کی بدترین شکل

تصوف ہے۔ جاہلانہ فلسفے میں زبان کا استعمال دھول اڑانے کے لیے ہوتا ہے تاکہ مخاطب الفاظ میں الجھ کر رہ جائے اور اس سے قاری کے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ لیکن جو فلسفہ حقیقت کے قریب تر ہوتا ہے اس میں مشکل اور گہری بات کو مخاطب تک آسان الفاظ میں پہنچانے کی کوشش ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بات کو ریاضی یا الفاظ کی مدد سے دوسروں تک نہیں پہنچا سکتا تو وہ اپنی بات کو خود بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں سے بھی عقل اور حسِ مشترک کی وحدت ظاہر ہوتی ہے۔ دماغ دنیا کے جزء کے طور پر ہی صحیح کام کرتا ہے، اس سے کٹ کر درست کام نہیں کرتا۔

سماجی علوم میں تکثر پسندی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا انسانوں کے بارے میں جو علم ہمارے پاس ہو، اسے اس صورت میں قبول کرنا ٹھیک ہوگا اگر ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ وہ حقیقت کا مکمل احاطہ نہیں کرتا اور ہمیں اپنے فہم میں مسلسل بہتری لانی ہے۔ حقیقت کو جاننے سے زیادہ اہم اس بات کو جاننا ہے کہ دوسرے لوگ بھی جسے حقیقت سمجھتے ہیں، اسے حقیقت سمجھنے کا حق رکھتے ہیں اور اسے بیان کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں۔ مختلف خیالات کو سن کر اور ان کی خامیوں سے آگاہ ہو کر ہی اپنے علم کی شفافیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ہر انسان جو تھوڑا سا علم یا فلسفہ سیکھ سکتا ہے اس کے لیے بھی اسکو کسی دباؤ سے آزاد ہو کر غور و فکر کرنا پڑتی ہے۔ مختلف معلومات اکٹھی کرنی پڑتی ہیں اور ان کے بارے میں شفاف اور مغالطوں سے پاک ذہن کے ساتھ سوچنا پڑتا ہے۔ لہٰذا کسی کو حقیقت سمجھانے سے

زیادہ اہم خود باتوں کو سمجھنا اور دوسروں سے تبادلۂ خیال کرنا ہے۔ تبادلۂ خیال بھی اس نیت سے کہ دوسروں کی آراء سے کچھ مزید سیکھنے کو ملے گا۔ دوسروں کی سوچ بدلنے کی کوشش اپنا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم صرف دوسروں کو سمجھ کر ان کے ساتھ اپنا تعلق بدل سکتے ہیں، اپنی بات منوانے کی کوشش بیوقوفی ہے۔ ہم صرف اپنی سوچ کا اظہار کر سکتے ہیں۔

روشن فکری کیا ہے؟

روشن فکری کا تعلق علم سے ہے، فکر کی روشنی اور عقلمندی سے ہے۔ یعنی جہالت سے نجات حاصل کرنا اور درست سوچنا روشن فکری ہے۔ روشن فکری کا مطلب خیالات کی آوارگی نہیں، بلکہ اپنی عقل کو استعمال کرنا اور غلطیوں سے نہ ڈرنا ہے۔ یہی فکری آزادی کی ضمانت بھی ہے۔ جیسا کہ عملی آزادی بھی معاشرتی زندگی کے لیے قانون سازی کی آزادی ہے، تاکہ اس قانون کا پابند رہا جائے۔ انسان صرف سماجی ضابطے کا پابند ہو کر ہی آزاد رہ سکتا ہے۔ ہماری اپنی فکری آزادی بھی اسی وقت تک باقی رہ سکتی ہے جب تک ہم باقیوں کی فکری آزادی پر قدغن نہ لگائیں۔

آج کل بہت سے لوگ آزادی سے یہ مراد لیتے ہیں کہ وہ کسی پابندی کا خیال نہ کریں اور جو جی چاہے سوچیں اور کریں۔ یوں وہ اپنے آپ کو باقی افراد سے کاٹ رہے ہیں، یہ روش عقل کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ روشن فکری نہیں، ذہنی تنہائی اور جہالت ہے۔ روشن فکر بننے کے لیے ضروری ہے کہ لوگ درست سوچیں، دوسروں کو سمجھیں اور وہ کریں جو صحیح ہو۔

خود کو عقلِ کل نہ سمجھیں اور دوسروں سے بھی فکری خطاؤں سے پاک ہونے کی امید نہ لگائیں۔ قوم پرست جماعتوں کے کارکنان کو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ دوسری زبانوں اور تہذیبوں سے رابطے کاٹ کر اور نفرت کی دیواریں کھڑی کر کے اپنی قوم کی خدمت نہیں کی جاسکتی۔ ظلم کا مقابلہ جہالت سے نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری قوموں کے افراد کو اپنی زبان سکھانے، ان کو اپنی قوم میں شامل کرنے اور ان کے افکار کا ترجمہ کرنے سے ثقافتی تنوع میں اضافہ ہوتا ہے، جو حسِ مشترک کے لیے مفید ہے۔ دینی طلاب کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ خود کو تصوف یا تشدد پر مبنی سیاست کی کوٹھری میں بند نہ کریں۔ دین میں بھی عرف کی بہت اہمیت ہے جسے حسِ مشترک (common sense) کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔

سوشل میڈیا کا خطرناک پہلو

سوشل میڈیا سماج کو جزیروں میں بانٹ رہا ہے۔ لوگ اپنی پسند کی تحریریں پڑھتے ہیں اور اپنے جیسے لوگوں سے ہی ملتے ہیں۔ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں سے الگ ہو کر اپنے جیسوں سے وحدت کر لیتے ہیں۔ اس اتحاد کا نتیجہ تخریب ہوتا ہے۔ اس سے وہ دنیا سے کٹ جاتے ہیں اور ان کا ذہن بند ہو جاتا ہے۔ مختلف مفاد پرست گروہ اس سے بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ فیس بک، یوٹیوب، واٹس اپ گروپس، انسٹا گرام، ٹک ٹاک، ایکس، وغیرہ سنسنی پھیلا کر ذہنی توازن کو بگاڑ رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کا زیادہ استعمال ہماری عقل کم کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ اسکا توڑ یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر چھپنے والی جدید کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا

جائے۔ اسی طرح اپنے شہر میں مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال کیا جانا چاہیئے۔ کتابوں کی دکانوں، کھیل کے میدان اور مختلف سوچ رکھنے والوں کی سماجی تقریبات میں جانا بھی مفید ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھار دوسرے شہروں میں جانا اور دوسرے ملکوں کا سفر کرنا بھی مفید ہے۔ حج و زیارات پر جائیں تو اپنے ساتھیوں تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ دوسرے ملکوں کے لوگوں سے بھی تبادلۂ خیال کرنا چاہیئے۔

سیاست کی حدود

سیاست کا تعلق سماج کے ساتھ ہے۔ اس کا تعلق فرد نہیں، بلکہ افراد سے ہے۔ اس کا تعلق افراد کے مشترکات سے نہیں، بلکہ ان کے اختلافات سے ہے۔ سیاست کا اصل سوال افراد کی آزادی ہے۔ سیاست تکثر کو قبول کرنے اور اختلافات کو سنبھالنے اور سماج میں توازن پیدا کرنے کا نام ہے۔ اسی لیے معاشرے کے اعداد و شمار (statistics) سے آگاہی سیاست میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ سماج انسانوں کے باہمی تبادلۂ خیال سے بنتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ سوشل میڈیا کی وجہ سے لوگوں کی سیاسی وابستگی بھی ان کو الگ تھلگ جزیروں میں بند کر رہی ہے۔ دوسروں کی آزادی کو سلب کرنے کی خواہش کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ بڑے لوگ وہ ہیں جو مثبت سیاست کر سکیں اور لوگوں کی آزادی کو یقینی بنا سکیں اور اپنے ساتھیوں کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے سے باز سکیں۔ سیاست میں زبردستی نہیں ہونی چاہیئے ورنہ سماج مر جائے گا اور افراد حسِ مشترک کھو دیں گے۔ ایک انسان کا قتل، پوری انسانیت کا قتل ہے۔

صرف انہی معاملات کو سیاست سے تعلق ہے جو سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاست کا ذاتی زندگی پر اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ آپ کی رشتہ داری، مذہبی عقائد اور قریبی دوستیوں کو سیاسی اختلاف سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ سیاست کو لوگوں کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔

جدید علوم عقلی علوم ہیں

ایک مغالطہ جو بعض نادان لوگوں کی طرف سے پھیلایا جارہاہے وہ یہ ہے کہ جدید سائنس کے عقلی علم ہونے سے انکار کیا جاتا ہے اور اس کے لیے تجربی علم کا عنوان تجویز کیا جاتا ہے۔ سائنس میں تجربے سے مراد ذاتی تجربہ نہیں، بلکہ وہ تجربہ ہے جس کی دوسرے تصدیق کریں جو کہ حسِ مشترک کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ جیسا کہ منطق کا تعلق بھی حسِ مشترک سے ہے، منطق ایسی باتوں پر قائم ہے جن کی دوسرے لوگوں کا تجربہ بھی تائید کرے۔ سائنس میں جس تجربے کے نتائج کو دوسرے ماہرین نہ پرکھ سکیں، اسے درست نہیں سمجھا جاتا۔ اسی لیے خواب کو علم کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا کہ وہ ذاتی تجربہ ہوتا ہے۔ متعدد تجربوں سے حاصل ہونے والی کلی معلومات کو ریاضی کی مساواتوں میں بیان کرکے دوسروں تک منتقل کیا جاتا ہے۔ جدید علوم کو سمجھنا ہو تو یونیورسٹیوں کی نصابی کتب کو دیکھنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ ان کا دارومدار جسمانی حسیات سے زیادہ عقلی کلیات پر ہے۔

عقلی اصول وہی کلیات ہیں جو صدیوں کے تجربے کا حاصل ہیں اور آزمائشوں پر پورے اترتے ہیں۔ دوہزار سال پرانی فلوطین کی توہمات کو عقلی علوم سمجھنا درست نہیں اور ان کی

بنیاد پر ایسے نتائج نکالنا جو خلافِ واقع ہوں، خود کو دھوکہ دینا ہے۔ وہ اس کی ذاتی خیال بافی اور نہایت محدود تبادلۂ خیال کا حاصل تھیں۔ اب تبادلۂ خیال کا افق بہت وسیع ہو چکا ہے۔ فلوطین کے عقل کے بارے تصورات کو اسلام نے مسترد کیا ہے۔ قرآن و حدیث میں عقل کو اچھے برے میں تمیز کی صلاحیت کہا گیا ہے، رہبانیت کی نفی کی گئی ہے اور عقل کے استعمال کی دعوت دیتے وقت جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

مسلم دنیا میں جدت پسندی

مسلمان معاشروں پر جب مغربی اقوام نے اپنا تسلط قائم کیا تو اس کو سمجھنے کی کوشش میں بعض افراد نے مغرب کا سفر کیا اور مغربی مفکرین کی کتب کا سرسری مطالعہ کیا۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مغرب کی ترقی کا راز دین کے بارے اس کے رویے میں مضمر ہے۔ یہ نہایت محدود معلومات کی بنا پر اخذ کیا گیا نتیجہ تھا، جس میں ان کے احساس کمتری کا بھی دخل تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے معاشرے میں جدید علوم متعارف کرانے کے بجائے دین پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ کچھ نے اسے مٹا دینا چاہا تو کچھ نے اس کی عجیب و غریب تشریحات کیں، جن سے دین سادہ نہ رہا اور اس کو سمجھنا پیچیدہ تر ہو گیا۔ جدت پسند مفکرین نے اجتہاد کی کھڑکی سے وہ کچھ نکالنا چاہا جو نہیں نکل سکتا تھا۔ مثلاً علامہ اقبال نے بیسویں صدی کے بدلے ہوئے زمانے میں پرانی خلافت کے احیاء پر زور دیا۔ وہ جدید وطن پرستی، یا نیشنلزم، پر بہت اچھی تنقید بھی کرتے ہیں مگر مسولینی جیسے ظالم مداری (demagogue) کی تعریفیں بھی کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ سے جدید قومی ریاست کے مسائل اجتہاد کے ذریعے

حل کرنے کی امید بھی رکھتے ہیں جبکہ ان مسائل کا اجتہاد سے کوئی حل نکالنا ممکن نہیں ہے۔ ملا پر تنقید کرتے ہیں مگر پیرِ رومی کے مرید کہلاتے ہیں۔ یہ ہمارے جدت پسند مفکرین کے ذہنی الجھاؤ کی ایک مثال ہے۔

ایک اور گروہ جس نے دین کو ترقی کا مخالف سمجھا وہ کمیونسٹ تھے۔ مسلمان معاشروں کے اکثر کمیونسٹ نیم خواندہ افراد تھے۔ انہوں نے کمیونزم کو بھی ٹھیک سے نہیں سمجھا تھا۔ مارکس کے بہت سے نظریات درست نہ تھے۔ جدید علوم کے اکثر اصول مارکس (متوفی 1883ء) کی وفات کے بعد دریافت ہوئے ہیں۔ ان حضرات کی جہالت کی انتہاء یہ تھی کہ یہ صوفیوں کو استبداد کے خلاف لڑنے والے ہیرو قرار دیتے رہے، جبکہ یہ ساتھ ہی خود کو سائنس کا حامی بھی کہتے تھے۔ مغرب کے کمیونسٹوں میں کم از کم اتنی عقل تھی کہ انہوں نے وہاں کے صوفیوں کو ترقی پسندی کا رہنما نہیں بنایا۔ بہر حال کمیونزم کے اس پروپیگنڈے کے توڑ کے لیے مغرب نے مسلم معاشروں میں اپنے اتحادیوں سے مولانا مودودی کے افکار کی ترویج کرائی۔ کمیونزم کے مقابلے میں مختلف تنظیمیں بنیں جن کو کمیونسٹوں کی تنظیموں کی طرز پر بنایا گیا اور انہی کی طرح کا گروہی تشدد سکھایا گیا۔ یوں مسلم دنیا بڑی طاقتوں کی زور آزمائی کا اکھاڑہ بن کر رہ گئی۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سرد جنگ کے دوران دوسروں کو مغرب کا ایجنٹ کہنے والے بہت سے سیاسی علماء خود مغرب کے آلۂ کار تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں دینی اداروں کے خلاف پُر تشدد کاروائیاں صرف انقلابِ فرانس کے دوران ہوئیں اور اس تشدد نے فرانس کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ایک اور قسم کے استبداد میں گرفتار کیا۔ آج بھی فرانس کا سیکولرازم اس دین دشمنی سے متاثر ہے۔ آج کے دور میں توہین آمیز خاکے بنائے جانا اسی شدت پسندی کا تسلسل ہیں، ان کا رائے کے اظہار کی آزادی سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی مغربی معاشروں کا سیکولرازم مختلف ہے۔ امریکہ میں آج بھی سب سے زیادہ چندہ دینی اداروں کو ملتا ہے۔ آج بھی وہاں عجیب و غریب نظریات والے فرقے پوری آزادی سے تبلیغ کرتے ہیں۔

مسلمان جدت پسندوں کی ایک اور غلطی اسلام اور مسیحیت میں موجود ایک بنیادی فرق کی طرف متوجہ نہ ہونا تھا۔ قرآن میں پاپائیت کی سخت مذمت آئی ہے۔ قرآن میں ارشادِ رب العزت ہے: ''انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا ہے اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی، حالانکہ انہیں حکم یہی ہوا تھا کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔[1]''

اسلام میں علماء کوئی الگ طبقہ نہیں تھے۔ انہوں نے لوگوں پر کوئی ٹیکس نافذ نہیں کر رکھا تھا نہ ہر شہر میں اس طبقے کے مرکز کے نمائندے اور عمارتیں ہوتی تھیں۔ مسلمانوں میں دینی تعلیم کا نظام آزاد تھا، ہر مسلمان دین کا علم سیکھ سکتا تھا۔ مالی ضروریات مخیر حضرات

---

[1] سورہ توبہ، آیت 31

پوری کرتے تھے۔عالمِ دین کو خدااور عوام کے بیچ واسطے کا کردار نہیں دیا گیا تھا۔ایسا نہیں تھا کہ آخرت کی بخشش علماء کی رضامندی سے مشروط ہوتی یا نکاح علماء کی آشیر باد کے بغیر ناجائز قرار پاتا۔علماء کا کام صرف دین بیان کرنا تھا۔وہ شادی کیا کرتے تھے،عام لوگوں کی طرح کاروبار کرتے اور مختلف شعبوں سے وابستہ ہوتے تھے۔

اگرچہ صوفیاء خود کو اللہ اور عوام کے بیچ روحانی وسیلہ بنا کر پیش کرتے تھے مگر وہ بھی کسی منظم ادارے کی شکل میں نہ تھے۔علماءانبیاؑ کے وارث تھے،آئمہؑ کے وارث نہ تھے۔علماء کو ایک استحصالی طبقہ قرار دے کر نشانہ بنانااور اس طبقے کے خاتمے کو ترقی کا لازمہ قرار دینا درست نہیں تھا۔یہی غلط فہمی تھی جس کی وجہ سے علامہ اقبال نے وہابیت کو مارٹن لوتھر کی اصلاحات سے تشبیہ دی۔رد عمل میں مسلم علماء میں بھی ایسے گروہ بن گئے جو خود کو پاپائے روم کی طرح خدا کا نمائندہ قرار دینے لگے۔روشن فکر افراد کے لیے ضروری ہے کہ مغرب کی نقالی کے بجائے اسے ٹھیک سے سمجھا جائے۔ہر معاشرے کے لیے ترقی کا ایک ہی راستہ تجویز کرنا درست نہیں۔اسی طرح مغرب کا بغض اور اس کے خلاف تعصب اور نفرت بھی درست نہیں ہے۔ترقی بہت پیچیدہ عمل ہے۔جدت میں نقالی نہیں چلتی، نقل لگا کر کوئی معاشرہ جدید نہیں ہو سکتا۔تقلیدی سوچ سے نجات پا کر اپنے مسائل کو سمجھنا ہو گا اور غلطیوں کی ٹھیک نشاندہی کرنی ہو گی۔بد قسمتی سے جدت پسندوں کی شدت پسندی اور اس کے ردِ عمل نے مسلم معاشروں میں برداشت کو ختم کر دیا ہے۔اس کا ہماری معیشت پر بہت برا اثر پڑا ہے۔

الحادِ جدید کا فتنہ

انسان کی مہذب زندگی کی بنیاد دین ہے۔ الحادِ جدید سے مراد دین سے نفرت کی وہ شکل ہے جو جدید دور میں سامنے آئی ہے۔ دین کو ناپسند کرنے والے اور اسے برا سمجھنے والے لوگ ہر زمانے میں رہے ہیں۔ لیکن جدید دور میں چونکہ مختلف علاقوں میں رہنے والوں کا آپس میں رابطہ اور گروہ بندی ممکن ہوئی ہے تو الحاد ایک فرقے کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اس الحاد میں شدت زیادہ ہے کیونکہ اس میں گروہ کا تعصب بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ حضرات انسانی فطرت میں دین کی ضرورت کا انکار کر کے غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور سائنس کا بہانہ بنا کر خدا کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ خدا کی صفات عددی نہیں ہیں اور اس لیے اس کی ذات تک رسائی انسان کے لیے ناممکن ہے۔

بعض اوقات یہ حضرات یونانی تصورِ خدا کو رد کر کے دین کے تصورِ خدا کے انکار کا نتیجہ لیتے ہیں جبکہ دین کا تصورِ خدا اس سے مختلف ہے جو یونانی فلسفیوں نے پیش کیا۔ یہ جدید علوم کا نام تو لیتے ہیں مگر لوگوں کو جدید علوم سکھانے کے بجائے تصورِ خدا کو رد کرنے کی بحث میں الجھا کر ان کو علم سے دور کر رہے ہیں۔ جدید ملحدین کا ایک مسئلہ دہشتگردوں کے جرائم کو دین کے ذمے لگانا ہے جبکہ محققین ان جرائم کے پیچھے دہشتگردوں کے سیاسی مقاصد اور دین کی غلط تشریح کا سراغ لگا چکے ہیں۔

بیسویں صدی میں کاغذ اور پرنٹنگ پریس کے عام ہونے نے آئیڈیالوجی کی بنیاد پر لوگوں کی نظریاتی قبیلوں میں تقسیم کا ایک نیا عمل شروع کیا۔ جدید قبائل نسل کے بجائے سوچ کی

بنیاد پر بنے۔ بعض لوگوں نے دین کو بھی آئیڈیالوجی سمجھ کر تنظیمیں بنائیں جبکہ یہ حقیقت کے خلاف تھا۔ دین میں مباحات کا میدان وسیع ہے اور تکفیر کی مذمت کی گئی ہے۔ آئیڈیالوجی کا مطلب یہ تھا کہ کچھ مشخص و محدود نظریات علم کا مکمل احاطہ کرتے ہیں اور وہی کامیابی کا واحد راستہ ہیں۔ عنقریب یہ نظریات دنیا کو فتح کرلیں گے۔ جو متفق نہ ہو اسے جینے کا کوئی حق نہیں۔ بھانت بھانت کے ازم آ گئے۔ کمیونزم اور اس کے خلاف بننے والی مذہبی تنظیمیں، دونوں کلٹ کی صفات کی حامل تھیں۔ چنانچہ ان کا حصہ بننے والا اپنے دماغ کو خاص چار دیواری میں بند رکھتا۔ احمق لوگوں کے لیے کلٹ سے وابستگی ذہنی سکون کا ذریعہ ہوتی، کیونکہ وہ انکے سب سوالوں کے سادہ جواب مہیا کرتی اور کتابیں پڑھنے کی محنت سے جان چھڑاتی۔ سائنس کو بھی مارکسزم کے اصولوں کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح اسلامسٹ حضرات کی طرف سے مولانا مودودی کی اسلام فہمی مکمل ضابطۂ حیات کہلائی اور اختلاف رکھنے والے نام نہاد مسلمان کہلائے۔ قبائلی طرز کا تعصب نظریاتی لوگوں کی پہچان بن گیا۔

سوشل میڈیا نے کلٹ سازی کے عمل کو مزید تقویت پہنچائی ہے جس کا مظاہرہ داعش کی طرف سے سوشل میڈیا کے استعمال کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آج بھی مختلف نظریاتی تنظیموں میں مخالفین کو دشمن اور انسانیت سے گرا ہوا جانور سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی جاسوسی اور آپس میں کھسر پھسر پر وقت برباد کیا جاتا ہے۔ کارکنان کے اذہان کو قابو میں رکھنے کے لیے مسلسل اور سستا لٹریچر شائع کیا جاتا ہے اور انہیں دوسروں کی تحقیقات پڑھنے

سے روکا جاتا ہے۔ جو ان سے الگ ہو اسے غدار اور دشمن کا ایجنٹ سمجھا جاتا ہے۔ اس پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں اور اس کے مبینہ انحراف پر اس کے ماضی کے بارے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ اختلاف رکھنے والے کی فکر کو سمجھنے سے زیادہ دشمن قبیلے کی مبینہ سازش کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جدید دور میں صوفیوں نے بھی سوشل میڈیا کو مختلف علاقوں میں موجود مریدوں پر اپنا کنڑول مضبوط رکھنے کیلیئے استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے۔

جدید الحاد بھی کلٹ کی صفات رکھتا ہے۔ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ عنقریب ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ جو ان سے متفق نہ ہو وہ انسانی حقوق نہیں رکھتا ہے۔ سوشل میڈیا پر الحاد کے کرشماتی قائدین بھی ظاہر ہو چکے ہیں جن کے پیروکاران کے گرد منظم ہو رہے ہیں۔ ان کی سوچ ہی علم کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ پروفیسر رچرڈ ڈاکنز وغیرہ ان کے مولانا مودودی ہیں کہ جن کی فکر مکمل ضابطۂ حیات سمجھی جاتی ہے اور ان سے اختلاف رکھنے والے کی روشن فکری اور سائنس دانی مشکوک قرار پاتی ہے۔ اس زمانے میں، جب علم اتنا وسیع ہو چکا ہے، کسی نظریاتی قبیلے میں خود کو شامل کر لینا بیوقوفی ہے۔

جدید ملحدین کے مقابلے کے نام پر کچھ لوگ انہی کی طرح گروہ بندی کر کے اسلام کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ ملحدین سے مناظروں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ لڑائی کا ماحول ان کو فائدہ پہنچائے گا۔ اس سے ممکن ہے ان کو چندے بھی مل جائیں اور یوٹیوب پر سبسکرائبرز بھی ہاتھ آئیں۔ البتہ اس سے الحادِ جدید کو اور ہوا ملے گی۔ کچھ لوگ

اِدھر، کچھ اُدھر ہو جائیں گے اور گروہی تعصب ان کی واپسی کا راستہ بند کر دے گا۔ تحریکِ خلافت کے بعد سے سیاسی علماء نے دین کو خطرے سے بچانے کے نام پر جتنے گروہ بنائے وہ تشدد اور جہالت کا شکار ہوئے اور ان کی وجہ سے دین بدنام ہی ہوا ہے۔ الحادِ جدید کا مقابلہ دھڑے بندی کے ماحول کو ختم کرنے، جدید علوم کو الحاد سے الگ رکھنے اور علمی تحقیقات کو صحیح شکل میں عوام تک پہنچانے سے ہی ہو سکتا ہے۔

یہ اہم ترین نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ الحاد انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس کے وسیع پیمانے پر پھیلنے اور غلبے کے امکانات بہت کم ہیں۔ ایسے میں الحاد کا خوف پھیلانا درست نہ ہو گا۔ معاشرے میں سنسنی کا ماحول بن جائے تو ایسی غیر فطری چیزوں کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ جدید الحاد چونکہ کلٹ کی صفات رکھتا ہے لہٰذا وہ گھن گرج کے ساتھ چھا جانے کے دعوے کر رہا ہے، لیکن ان دعوؤں کی حیثیت قبائلی جنگوں میں پڑھے جانے والے رجز سے زیادہ نہیں ہے۔

جدید علوم کی تشکیل میں مسلم دنیا کا بھی حصہ ہے، یہ انسان کی مشترکہ میراث ہیں۔ جدید علوم نے پچھلی کئی صدیوں میں مغرب سے دین کو ختم نہیں کیا تو آئندہ بھی دین کی جگہ نہیں لیں گے۔ جدید علوم پر الحاد کی اجارہ داری کو تسلیم کرنا اور یونیورسٹیوں کو الحاد کے قلعے سمجھنا نادانی ہے۔ اس سے ہماری نوجوان نسل بھی جدید علوم سے دور ہو جائے گی۔ باقی دنیا تو جدید علوم میں آگے بڑھتی رہے گی، نقصان صرف ہمارا ہو گا۔

پھکی فروش حکیموں سے ہوشیار رہنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو کچھ لوگ اس کے حل کے نام پر اپنا پرانا چورن نئی پیکنگ میں بیچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کرونا آیا تو بعض لوگوں نے اسلامی طب کے نام پر وہ دوائیں کرونا کی روک تھام کے لیے تجویز کیں جو پہلے کسی وبا کے خلاف کارگر ثابت نہ ہوئی تھیں۔ اب الحاد کے مقابلے کے نام پر کچھ لوگ ''اسلامی فلسفے'' کا بزنس شروع کر چکے ہیں۔ دین کے نام پر یونانی فلسفے یا تصوف کی توہمات پھیلانے سے دین کی بدنامی ہو گی۔ پچھلے دو سو سال کی تاریخ میں یہ فلسفہ کسی علمی محاذ پر کام نہیں آیا۔ حال میں بھی ایران میں ملا صدرا کا فلسفہ الحاد کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہے۔

تیل کی دولت کا غلط استعمال

مسلم دنیا کی بدقسمتی ہے کہ جب مشرق وسطیٰ میں مغربی علوم کی وجہ سے تیل اور گیس دریافت ہوئے تو کچھ ممالک نے وہ سرمایہ وہابیت اور اخوانی سوچ (islamism/totalitarianism) پھیلانے پر لگایا تو کچھ نے ملا صدرا کا فلسفہ پھیلانے پر لگایا۔ روس نے بھی مارکسی فلسفہ پھیلانے پر زور دیا۔ یہ سرمایہ جدید علوم پر خرچ نہ ہوا۔ اس کا نقصان غریب ملکوں کو ہوا کہ جن کے پاس دماغی صلاحیت کے سوا اپنی معیشت بہتر کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ تیل اور گیس کی دولت والے ملکوں کے عیب تو مفت کی دولت نے چھپا لیے، مگر جن ممالک کے پاس یہ دولت نہ تھی وہ پہلے سے بھی بری حالت میں چلے گئے۔

نوجوانوں سے التماس

زندگی کے پہلے پچیس سال جذباتی لگاؤ کے شدید رجحانات اور معلومات اور تجربے کی کمی جیسی وجوہات کی بناپر حساس ہوتے ہیں۔ ان سالوں میں جدید علوم سیکھنے چاہئیں۔ منطق بھی سیکھنا ہو تو مدرسوں والی منطق کے بجائے جدید منطق سیکھنی چاہیے۔ پہلے سائنس، معیشت یا تاریخ وغیرہ کی تعلیم مکمل کر لینی چاہئے۔ جو دینی علوم سیکھ رہے ہیں وہ بھی ادبیات اور قرآن و حدیث پر توجہ دیں۔ جوانی کو ہر صورت فلسفے اور سیاسی وابستگی سے پاک رہنا چاہیے۔ ان دونوں میں اختلاف بہت زیادہ ہے، پہلے میں نظری تو دوسرے میں عملی، لہٰذا یہ کام بڑوں کے لیے چھوڑ دینے چاہئیں۔ سیاست کے بارے میں تعلیم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن کسی تنظیم سے عملی وابستگی درست نہیں ہے۔ اسی طرح فلسفے میں چونکہ نظری اختلاف بہت زیادہ ہے، تو اسے پڑھنے سے پہلے اتنا علم حاصل کرلیں کہ جلدی دھوکہ نہ کھائیں۔ اختلاف کے سمندر میں اترنے سے پہلے مگرمچھوں سے نبٹنے کی صلاحیت پیدا کرلیں۔ آپ کو مفت میں فلسفہ سکھانے والے کو بھی پیٹ لگا ہوا ہے، وہ کہیں سے مال لے کر ہی یہ سب کر رہا ہے۔

وقت کا درست استعمال کیا ہے؟

اپنے وقت کو مخلوقات کی ماہیت سمجھنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ خدا کے وجود کے بارے فلسفہ بافی سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ :

"اس بات کو یاد رکھو کہ علم میں راسخ و پختہ لوگ وہی ہیں کہ جو غیب کے پردوں میں چھپی ہوئی ساری چیزوں کا اجمالی طور پر اقرار کرتے ہیں، اگرچہ ان کی تفسیر و تفصیل نہیں جانتے۔ یہی اقرار انہیں غیب پر پڑے ہوئے پردوں میں درانہ گھسنے سے بے نیاز بنائے ہوئے ہے۔ اللہ نے اس بات پر ان کی مدح کی ہے کہ جو چیز ان کے احاطہ علم سے باہر ہوتی ہے اس کی رسائی سے اپنے عجز کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اللہ نے جس چیز کی حقیقت سے بحث کرنے کی تکلیف نہیں دی اس میں تعمق و کاوش کے ترک ہی کا نام رسوخ رکھا ہے۔ لہٰذا بس اسی پر اکتفا کرو اور اپنے عقل کے پیمانہ کے مطابق اللہ کی عظمت کو محدود نہ بناؤ، ورنہ تمہارا شمار ہلاک ہونے والوں میں قرار پائے گا۔"[1]

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ○[2]

حمزہ ابراہیم

ستمبر 2025ء

---

1 نہج البلاغہ، خطبہ 89–خطبۂ اشباح، ترجمہ: مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ

2 آل عمران، آیت 8

1. خدا پر ایمان اور جدید سائنس

جدید سائنس کے مطابق دنیا مسلسل ہونے والے اتفاقات پر قائم ہے۔ ان اتفاقات کی کوئی علت نہیں ہوتی جو زمان و مکان رکھتی ہو، یعنی ان سے مشابہت رکھنے والا کوئی سبب ان کے رونما ہونے کی وجہ نہیں ہوتا۔ بنیادی ذرات توانائی کی مختلف شکلیں ہیں جن کے خواص الگ الگ ہیں اور وہ اتفاقی طور پر پیدا اور فنا ہوتے ہیں۔ ان اتفاقات میں ہر چیز کے خواص کی مناسبت سے نظم ہوتا ہے۔ ایک قسم کے سب اتفاقات (events) ایک جیسے نظم (distribution) سے ظہور کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان سے جب بڑے اجسام تشکیل پاتے ہیں تو ان بڑے اجسام میں ایک علت و معلول والا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ جہاں چھوٹے ذرات میں علت و معلول کے اصول کی پابندی ضروری نہیں ہوتی، وہیں روزمرہ کی زندگی میں علت و معلول کا قانون ایک واقعیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ہر معلول کی کوئی علت ہوتی ہے جو زمانی طور پر اس سے پہلے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وہ اور معلول اپنی اصل میں جڑے ہوتے ہیں، ایک طرح کا ذاتی تعلق رکھتے ہیں۔

روزمرہ کی منطق کا مطلق انکار کرنا سائنسی رویہ نہیں ہے اور اس کے بڑے اجسام تک محدود ہونے کا انکار کرنا بھی کم علمی ہے۔ منطق کے اصولوں کی بنیاد میں چھوٹے اجسام کو بیان کرنے والے سائنسی اصول موجود ہیں۔ زندہ اشیاء کا ارتقاء بھی اتفاقات کے اصولوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ یونانی منطق کی پابندی میں غلو کا شکار ہیں وہ نظریۂ ارتقاء، بگ بینگ، یا دیگر گہرے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کئے بنا ان کا انکار کر

دیتے ہیں۔ان کے اتفاقی ہونے (randomness) کو ٹھیک سے سمجھنا ضروری ہے۔

تسلسل کے محال ہونے کو بھی ریاضی میں پیشرفت باطل ثابت کر چکی ہے۔[1] بعض لامتناہی سلسلوں کا قابل جمع ہونا سائنس میں کئی ایک مظاہر کی درست تشریح کیلئے استعمال ہو رہا ہے۔ سائنس میں زمان و مکان کا حادث اور کائنات کا حادث ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے۔ نیز ان کی نسبیت بھی ثابت شدہ ہے۔ نسبیت صرف زمانی نہیں بلکہ مکانی اور جسمانی بھی ہے۔

کائنات ابتداء میں چھوٹے ذرات کے اکٹھ کی صورت میں تھی جو ایک بادل کی طرح تھے۔ بعد میں بڑے اجسام بنتے گئے۔ تاہم اب بھی دنیا کے تمام مظاہر کے پیچھے اتفاقات اور ان کے گوناگوں طریقے ہیں۔

ایسے میں اگر یہ کہا جائے کہ ہر اتفاق کے رونما ہونے میں ایسے خدا کا فیصلہ کار فرما ہے، جو ان سے ذاتاً جدا ہے اور ان سے علت و معلول جیسا زمانی رابطہ نہیں رکھتا، تو اس کو یونانی تصور خدا سے جدا سمجھنا چاہیئے جس میں پرانی سوچ کے مطابق علت و معلول کا اصول خدا اور کائنات پر لاگو کیا جاتا تھا۔

[1] Sum of a convergent infinite series is finite. An infinite geometric series a, ar, ar^2, ... converges when $|r| < 1$ and hence we can find its sum using the formula: a / (1 - r).

قرآنی تصورِ خدا

یونانی تصور خدا کے بر عکس قرآن میں خدا کے بارے میں یہ معلومات دی گئی ہیں:

1۔جب حضرت موسیٰؑ سے خدا کے بارے سوال ہوا تو انہوں نے کہا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِی اَعطٰی کُلَّ شَیءٍ خَلقَهٗ ثُمَّ ہَدٰی.[1]

ترجمہ: ''انہوں نے کہا کہ ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت کی۔''

علت و معلول کے یونانی تصور کے بر عکس یہاں خدا ہر مظہر کی علت نہیں بلکہ ہر ایک کا براہِ راست خالق ہے۔ خلق ہونے کے عمل میں کوئی واسطہ نہیں، اور خدا ہی کی ہدایت کے مطابق ہر مظہر الگ طریقے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ایسا نہیں کہ مخلوق کو پیدا کرنے میں خدا واسطوں کا محتاج ہو۔ خدا کو قادرِ مطلق ماننے کا بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔یونانی تصور خدا کے مطابق خدا چیزوں کو بنانے میں علتوں کے سلسلے کا محتاج ہے، جس میں پہلی علت وہ اور دوسری علت کوئی اور ہے، علیٰ ہذا القیاس۔

---

[1] سورہ طہٰ، آیت 50

2۔ قرآن میں خدا کی ایک صفت باری آئی ہے جو افلاطون کے مثالی موجودات کے غیر سائنسی تصور کے برعکس بغیر مثال کے خلق کرنے کے معنوں میں ہے۔[1]

3۔ سورہ اخلاص میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خدا میں سے کچھ نہیں نکلا، نہ خدا کسی سے نکلا ہے: لم یلد و لم یولد۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا اور مخلوقات اپنی اصل میں الگ ہیں۔ یہی بات اس آیت: لیس کمثلہ شیء، اس اللہ جیسی کوئی چیز نہیں، سے بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ اہلبیتؑ کے اقوال میں آیا ہے کہ خدا کی ذات خلق سے خالی ہے اور خلق خدا سے خالی ہے۔ وہ مخلوقات کی مجانست و مشابہت سے پاک ہے۔

ہمارا دماغ اشیاء کا علم اعداد اور الفاظ کی مدد سے حاصل کرتا ہے۔ الفاظ و اعداد سے ذہن کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر خدا کو اشیاء سے بالکل جدا سمجھا جائے تو اس کی ذات کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حقیقت اعداد و الفاظ کی شکل میں بیان نہیں ہو سکتی۔

---

[1] حضرت فاطمہ زہراؑ کا فرمان ہے: الْمُمْتَنِعُ عَنِ الْاَبْصارِ رُؤْيَتُهُ، وَ مِنَ الْاَلْسُنِ صِفَتُهُ، وَ مِنَ الْاَوْهامِ كَيْفِيَّتُهُ. اِبْتَدَعَ الْاَشْياءَ لا مِنْ شَيْءٍ كانَ قَبْلَها، وَ اَنْشَاَها بِلَااحْتِذاءِ اَمْثِلَةٍ اِمْتَثَلَها، كَوَّنَها بِقُدْرَتِهِ وَ ذَرَأَها بِمَشِيَّتِهِ، مِنْ غَيْرِ حاجَةٍ مِنْهُ اِلى تَكْوينِها.

ترجمہ: ''نہ اسے آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی زبان اس کا وصف بیان کر سکتی ہے۔ وہم و خیال اس کی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہر چیز کو لا شے سے وجود میں لایا اور کسی نمونے (form) کے بغیر ان کو ایجاد کیا۔ اپنی قدرت سے انہیں وجود بخشا اور اپنے ارادے سے ان کی تخلیق فرمائی۔'' (خطبۂ فدک، ادارہ نشر معارف اسلامی، لاہور، 2008ء)

عقل خدا کے بارے جو بھی تصور بنا لے وہ درست نہیں ہو گا کیونکہ ہماری عقل ہمارے دماغ کے مخلوقات سے تعامل کے نتیجے میں بنتی ہے۔ صرف سائنسی طریقۂ کار ہی نہیں، کسی بھی ذریعے سے انسانی عقل خدا کی ذات کا علم حاصل نہیں کر سکتی۔ عقل صرف مخلوقات کا علم حاصل کر سکتی ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں موضوع سائنس کی حدود سے باہر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی عقل کی حدود سے باہر ہے، اس کا علم ہمیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہاں ایمان لایا جا سکتا ہے اور قرآن میں خدا پر ایمان لانے ہی کی دعوت دی گئی ہے، فلسفیانہ دلیلیں قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

جدید سائنس توانائی کا زمان و مکان کے ساتھ تعلق بھی ثابت کر چکی ہے۔ لیس کمثلہ شیء کا نتیجہ خدا کا زمان و مکان سے پاک ہونا بھی ہے۔

4۔ خواجہ نصیر الدین طوسی وغیرہ نے خدا کو واجب الوجود اور مخلوقات کو ممکن الوجود کہا ہے۔ اتفاقات ممکن الوجود ہی ہیں اور جب ان کے رونما ہونے اور نہ ہونے میں امکان (probability) کا عمل دخل ہے تو عقل ایسے خدا پر ایمان کو لازمی سمجھتی ہے جس کا ہونا حتمی اور یقینی ہو۔ اس ایمان کے بغیر انسان کی عقل توازن کھو سکتی ہے۔

5۔ خدا کے بارے میں ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان کے بغیر انسان کو درندگی سے بچنے میں مشکل ہوتی ہے۔ جدید سائنس کے مطابق زندہ اشیاء کے ارتقاء میں ہم نوع کے ساتھ تعاون بقا کی بنیادی شرط تھی۔ انسانوں کو جب قوت گویائی عطا ہوئی تو انسانوں کا آپس

میں تعاون باقیوں کی نسبت بہت زیادہ بڑھ گیا۔ یہ سیاست کی ابتداء تھی جس نے انسان کو زمین کی باقی مخلوقات پر فضیلت دے دی۔ یہاں مشترکہ تصور خدا پر ایمان نے انسانوں کو مل کر مشکلات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا۔

بعض ملحدین سائنس کے نام پر یونانی تصورِ خدا کو رد کر رہے ہیں لیکن اس بنیاد پر مذاہب کے پیروکاروں میں موجود اس تصور خدا سے بھی انکار کر دینا غیر سائنسی رویہ ہے۔ خود ان حضرات کے ہاں بھی مذہب سے لگاؤ پایا جاتا ہے۔ پروفیسر رچرڈ ڈاکنز نے خود کو ثقافتی طور پر مسیحی کہا تو پروفیسر سٹیون وائنبرگ خود کو یہودی کہتے تھے۔ جس خدا کو یہ نہیں مانتے وہ تو ارسطو اور فلوطین کا خدا ہے۔ اگر یہ اپنے سماج کے مطابق ایک مذہب سے جڑے ہیں تو باقی لوگ بھی اپنے مذہب سے جڑے رہ سکتے ہیں۔

انسان کا دماغ بہت پیچیدہ ہے اور اس میں ہم نوع کے ساتھ تعاون کی کوئی بنیاد نہ ہو تو اس کا شر بہت بڑھ سکتا ہے۔ جنگ عظیم اول اور دوم میں یہی شر کھل کر سامنے آیا تھا۔ اب جبکہ دنیا میں دوبارہ جنگ عظیم دوم سے پہلے والا ماحول پیدا ہو رہا ہے تو ایسے میں باہمی تعاون اور اخلاق کی زیادہ ضرورت ہے۔ انسان معاشرہ بنانے میں اخلاقیات، ضابطوں اور رسوم و رواج کا محتاج ہے۔

انسان خدا کی ذات کا علم اگر حاصل نہیں کر سکتا تو اس پر ایمان رکھ کر اخلاقیات کو ایک محکم بنیاد فراہم کر سکتا ہے اور یوں ایک مہذب زندگی گزار سکتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے

ساتھ تعلق کی نوعیت پر غور کرنے کو اس معرفتِ نفس کا حصہ سمجھا جا سکتا ہے جو خدا پر ایمان میں مددگار ہوتی ہے۔[1] انسانی جسم کی معرفت سے زیادہ دوسرے افراد اور انسانوں کے مختلف گروہوں سے اپنے رابطے کی معرفت ایمان میں اضافے میں زیادہ مددگار ہو سکتی ہے۔

جو لوگ سائنس کو الحاد کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں وہ اصل میں خالق کو مخلوق میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ مذہب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خالق اور مخلوق میں کوئی سنخیت نہیں ہے، وہ اشیاء سے بالکل الگ ہے۔ صوفیاء وحدت الوجود کی غلط فہمی کا شکار ہوئے تو مخلوقات کو خالق کا جلوہ قرار دیا۔ یوں وہ اشیاء کی ماہیت کو سمجھنے سے قاصر رہے اور معقولات میں کوئی حصہ نہ ڈال سکے۔ الٹا لایعنی باتوں میں پڑ گئے۔ ملا صدرا نے ایٹم کا انکار کیا۔[2] اس نے یہ بھی کہا: فواجب الوجود کل الاشیاء لا یخرج عنه شیء من الأشیاء، ترجمہ: ''پس واجب الوجود اشیاء کا کل ہے، کچھ بھی اس سے باہر نہیں ہے''۔[3] یوں خالق و مخلوق کی

---

[1] سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ اَوَ لَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ.

ترجمہ: ''ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یقیناً وہی (اللہ) حق ہے، کیا آپ کے رب کا یہ وصف کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر خوب شاہد ہے؟'' (سورہ فصلت، آیت 53)

[2] اسفار اربعہ، جلد 2، صفحہ 94۔

[3] اسفار اربعہ، جلد 2، صفحہ 368۔

بینونت اور جدائی کا سرے سے انکار کیا اور واجب و ممکن کا فرق مٹا کر کائنات کو ہی واجب الوجود قرار دیا۔ اگر غور کیا جائے تو یہی بات ملحدین بھی کہہ رہے ہیں کہ کائنات خود سے ہے۔ صوفی لوگ مخلوقات کو سرے سے نہ سمجھ سکے۔ ہمیں ان دونوں گروہوں سے دور رہنا ہے۔ صوفیوں کے ساتھ تو ویسے بھی ان کی پراسراریت کی وجہ سے تبادلۂ خیال ممکن ہی نہیں ہوتا۔

خدا کی ذات کا علم حاصل کرنا تو ممکن نہیں لیکن یہ جاننا ممکن ہے کہ وہ کیا نہیں ہے۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا یکتا اور احد ہے، وہ اپنی مخلوق جیسا نہیں ہے۔[1] چنانچہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ انہوں نے مختلف موجودات پر غور کرنے کے بعد اپنی قوم سے کہا کہ ان میں سے کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں ہے۔[2] قرآن و حدیث میں جابجا اشیاء کو خدا کی آفاقی نشانیاں کہا گیا ہے اور ان کی پہچان کی ترغیب دی گئی ہے[3]، تاکہ ہم ان کو پرستش کے قابل نہ سمجھیں۔ جن چیزوں کا ہم علمی احاطہ کر لیتے ہیں ان پر خود کو قربان نہیں کیا کرتے۔ اپنے بارے بھی غور کرنے کا کہا گیا ہے۔ ہمارا دوسرے انسانوں سے تعلق اور ہماری زندگی میں ہمارے ارادے بار بار ٹوٹنا بہت حیران کن ہے۔[4] بے شک

---

[1] سورہ شوریٰ، آیت 11۔

[2] سورہ انعام، آیت 78۔

[3] سورہ فصلت، آیت 53۔

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، 250۔

ہماری خواہشات بھی اندھی پیروی کے لائق نہیں اور ہمیں وہی کرنا چاہئے جو اخلاقی طور پر درست ہو۔[1]

مذہب کا منفی استعمال

البتہ بعض شاطر لوگ مذہب کا منفی استعمال بھی کرتے ہیں۔[2] اس لئے اپنی زندگی کے فیصلوں کیلئے اپنی عقل پر بھروسہ کرنا اور اپنی عقل کو استعمال کرنا بہت ضروری ہے، جیسا کہ قرآن میں بھی بار بار عقل کو استعمال کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پیشہ ور مذہبی رہنما مقدس کتابوں کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو مذہب اور ایمان کے مقصد کے خلاف ہوتی ہے۔ وہ مذاہب کے درمیان اختلافات کو جتھہ بندی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ یوں انسان ایک گروہ سے تو منسلک ہوتے ہیں اور وہاں باہمی اتحاد پر زور دیتے ہیں، لیکن دوسرے گروہوں کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ ان کی عقلیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔ یہ کام باقی مذاہب کی طرح اسلام کے معاملے میں بھی ہو رہا ہے۔ مذہب کو پیشے کے طور پر اختیار کرنے والوں کو سیاسی رہنما نہیں سمجھنا چاہئے۔

---

[1] سورہ جاثیہ، آیت 23۔

[2] يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّهۡبَانِ لَيَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ (سورہ توبہ، آیت 34)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! بہت سے علماء اور راہب ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور انہیں راہ خدا سے روکتے ہیں۔''

یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی آبادی میں انتہا پسندوں کا تناسب بہت کم ہے۔اکثر لوگ معقول زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ مسلمان صدیوں تک غیر مسلموں کے ساتھ رہتے رہے ہیں۔ موجودہ شدت پسندی اسلام کا لازمہ نہیں ہے۔ ہر دہشتگرد مسلمان نہیں ہوتا۔انتہا پسندی اور غلط تفسیر کا معاملہ صرف مذہب کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ مارکسزم اور قوم سے محبت کی انتہا پسندانہ تشریحات نے بھی دنیا میں بہت تباہی مچائی ہے۔

انتہا پسندی نقصان دہ ہے

ظلم اور جہل آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جاہل ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔[1] یہی انتہا پسندی ہے۔ اسی لیے خدا پر ایمان کے ساتھ ساتھ حتی الوسع سائنس اور دوسرے جدید علوم سیکھنا بھی ضروری ہے۔ سائنس سے مراد کسی سائنسدان کا قول نہیں نہ ہی کسی سائنسدان کا مقالہ ہے، بلکہ وہ بات سائنس کا حصہ ہوتی ہے جس پر سائنسدانوں کا اجماع ہو۔جب کسی نظریے پر اتفاق رائے ہو جاتا ہے تو وہ سائنس کی نصابی کتب میں شامل ہوتا ہے۔ سائنس سیکھنے کیلئے سائنس کی نصابی کتب پڑھنی چاہئیں، کسی سائنس دان کے شاذ قول کی سائنس میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

---

[1] لَا تَرَى الْجَاهِلَ اِلَّا مُفْرِطًا اَوْ مُفَرِّطًا.

ترجمہ: ''جاہل کو نہ پاؤ گے، مگر یا حد سے آگے بڑھا ہوا اور یا اس سے بہت پیچھے۔'' (نہج البلاغہ، حکمت 70)

جہلِ مرکب سے بچنے کی ضرورت

اہلِ تصوف و عرفان کے جہلِ مرکب سے بچنا بھی ضروری ہے۔ وہ مبہم باتیں کرکے زبان کا معنوی نقصان کرتے ہیں۔ وہ الفاظ میں الجھاتے ہیں۔ وہ علم، وجود، عشق، غرض ہر لفظ کا ایسا ٹیڑھا مطلب نکالتے ہیں جس کی غیر جانبدار لوگ تصدیق نہیں کرسکتے۔ اکثر اوقات تو وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ یوں زبان کا جو مقصد ہے، یعنی باہمی افہام و تفہیم، وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ زبان کی تباہی سے حماقت اور حماقت سے تشدد جنم لیتا ہے۔ جدید دور میں سوشل میڈیا کی بدولت وہ یہ غلط فہمیاں دوسروں تک بھی زور و شور سے منتقل کررہے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر لفظ کا معنی بگاڑ دیں۔ یوں عقلوں کو ماؤف کرکے اپنا دھندہ چلائیں۔

جن لوگوں کی عقلوں کو اہلِ تصوف و عرفان خراب کرتے ہیں وہ ان کی خانقاہوں تک محدود نہیں رہتے اور کسی بھی شدت پسند تنظیم کیلئے مفت کے کارکن بن جاتے ہیں۔ احمق انسان شدت پسند ہوتا ہے۔ کسی بیوقوف انسان کو کوئی بھی آسانی سے استعمال کرسکتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف الحاد سے بچاتا ہے، لیکن اگر نوجوانوں کو الحاد سے بچا کر خارجی بنانا ہے تو اس سے کیا ملے گا؟ الحاد کا جواب تصوف کی حماقت نہیں بلکہ قرآن کا تصورِ خدا ہے۔

زبان کی تباہی کے دیگر اسباب

زبان کی بربادی اہل سیاست کے ہاتھوں بھی ہوتی ہے۔ وہ بلند بانگ وعدے کرتے ہیں اور خطابت پر زور دیتے ہیں۔ یونانیوں کے ہاں بھی سوفسطائی خطابت سے کام چلاتے تھے اور الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ان کے معنوں کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ آج کل غیر تربیت یافتہ صحافی بھی زبان کے ذریعے آگ بھڑکا رہے ہیں۔ ویوز لینے کیلئے بے تکی اور مصالحہ دار باتیں کی جاتی ہیں۔

طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہ اٹھائیں

اسلام ہمیں اپنی طاقت کی حد تک ظلم اور جہالت کی مخالفت کرنے کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ جدید دور میں جتھہ بند تشدد کے اسباب میں جہالت بھی ایک بڑا سبب ہے۔ خدا پر ایمان ہمیں ان اندھیروں کے مقابلے میں چھوٹے سے چراغ جلانے کا حوصلہ دے سکتا ہے۔ تاہم اپنی طاقت سے زیادہ بڑا چراغ جلانا درست روش نہیں۔[1] اس سے آپ زندگی کا توازن کھو سکتے ہیں اور جلد بازی میں کوئی نقصان کر سکتے ہیں۔

---

[1] لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ.

ترجمہ: ''اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتا، ہر شخص جو نیک عمل کرتا ہے اس کا فائدہ اسی کو ہے اور جو بدی کرتا ہے اس کا انجام بھی اسی کو بھگتنا ہے۔'' (سورہ بقرہ، آیت 286)

جدید طبیعیات کی بنیادیں

موجودات کو بہتر طور پر سمجھنے کیلیۓ عقلیاتِ معاصر سے رجوع کیا جانا چاہیۓ۔ معقولات سے مراد واقعیت کا وہ بیان ہے جس پر ہمارے اپنے دور کے عقلاء کا اتفاق ہو۔ یہ باتیں عموماً یونیورسٹیوں کی درسی کتب میں جمع کی گئی ہوتی ہیں۔ اجماعِ عقلاء سائنس میں زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے۔ سائنس کو ماضی میں طبیعیات کہتے تھے۔ جن باتوں پر عقلاء میں اختلافِ رائے زیادہ ہو، جیسے نفسیات، لسانیات، اخلاقیات، تاریخ، سیاسی نظریات، معیشت، مذہب، وغیرہ، انکو مابعد از طبیعیات میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سب انسان شناسی میں آتے ہیں۔ اسی لیے جوانی میں مذہبی اور سیاسی جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیئے بلکہ اپنی عقل پختہ کرنے پر اپنا وقت صرف کرنا چاہیئے۔ عقلمند آدمی وہی ہے جو پہلے طبیعیات سیکھ لے تاکہ بعد میں دوسرے مسائل میں پڑتے ہوۓ الجھن کا شکار نہ ہو۔ جو لوگ فلسفے کا شوق رکھتے ہیں ان کیلیۓ بھی جدید طبیعیات کی سمجھ بوجھ لازمی ہے، ورنہ وہ جدید فلسفے کی بنیادوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یونانی طبیعیات پڑھ کر جدید مسائل پر بات کرنا وقت کا ضیاع ہے۔

جدید طبیعیات پر حال ہی میں ایک بہت اچھی کتاب آئی ہے۔ اس کتاب کو کیمبرج یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے اور اس کا عنوان ہے، Foundations of Modern Physics، اور اسے پروفیسر سٹیون وائنبرگ (Steven Weinberg) نے لکھا ہے جو حال ہی میں وفات پا گئے ہیں۔ اسے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب انکی باقی کتابوں کی نسبت مختصر ہے۔ تاہم اس میں جدید طبیعیات کے بنیادی نظریات

کو اتنی تفصیل سے ضرور بیان کیا گیا ہے کہ کوئی غلط فہمی ایجاد نہ ہو۔ عموماً عوام کیلئے لکھی گئی سائنسی کتابوں میں ریاضی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کتاب کو بغیر استاد کے پڑھنا مشکل ہو گا مگر ناممکن نہیں ہو گا۔اس کتاب کو پوری طرح حل کرنے کیلئے جدید ریاضی سے کچھ آشنائی ضروری ہے۔ پاکستان میں جو لوگ یونیورسٹیوں میں سائنس یا ٹیکنالوجی کے کسی شعبے میں پڑھتے رہے ہیں وہ اس کتاب کو مکمل طور پر حل کر سکیں گے۔ لیکن جو لوگ جدید ریاضی اچھی طرح نہیں جانتے وہ بھی کتاب کے انگریزی متن سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ کتاب میں انگریزی متن اس سطح کی باقی کتابوں کی نسبت بہت زیادہ ہے جسے انگریزی جاننے والے عام لوگ پڑھ سکتے ہیں۔

جہاں تک فزکس کے طالب علموں کا تعلق ہے تو ان کیلئے بھی یہ کتاب یوں مفید ہے کہ اس میں ہر باب کی ابتداء میں ایک تاریخی تناظر دیا گیا ہے۔ یوں وہ اس کتاب کو اصلی کتابوں کے ساتھ اضافی مطالعے کیلئے پڑھیں تو بہت فائدہ ہو گا۔اس سے معلوم ہو گا کہ موجودہ نظریات تک پہنچنے میں کس قدر محنت صرف ہوئی اور کن دلائل کی وجہ سے ماضی کی طبیعیات کو ترک کرنا پڑا۔ اس کتاب کو کالجوں میں پڑھنے والے ایف ایس سی اور اے لیول کے بچے بھی خرید کر یا فوٹو کاپی کی دکان سے پرنٹ کروا کر پاس رکھیں تو یہ یقیناً لمبے عرصے تک ان کیلئے مفید رہے گی۔ تاہم اسے بی ایس کے دوسرے سال، یعنی تیسرے یا چوتھے سمیسٹر، میں ایک کورس کے طور پر بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔

کتاب کے کل سات ابواب ہیں۔ پہلا باب ابتدائی ایٹمی تھیوری کے بارے میں ہے۔ چار سو قبل مسیح میں دی مقراطیس نے اس کی بنیاد رکھی تھی جسے ایپی کیورس نے آگے بڑھایا۔ عربی میں یونانی فلسفے کا ترجمہ ہوا تو صوفیوں نے اسے جھٹلایا لیکن اشاعرہ نے اسے اپنایا۔ رومیوں کے ہاں بھی اسکاذکر ہوتا رہا۔ لیکن اس پر کوئی خاص پیشرفت اس وقت تک نہ ہوئی جب تک بدیہیات کی تطہیر کیلئے تجربے کو بنیاد نہ بنایا گیا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپ میں گیسوں کی صفات کو عدد کی شکل میں ماپنے اور ان پر نئی طرح کے تبادلۂ خیال کا آغاز ہوا۔ یاد رہے، طبیعیات میں تجربے سے مراد کسی شخص کا تجربہ نہیں بلکہ وہ تجربہ ہے جس پر عقلاء کا اتفاق ہو، یعنی کئی لوگوں نے اسے کر کے پرکھا ہو۔ بہر حال گیسوں پر تحقیق سے یورپ میں جدید کیمسٹری کی بنیادیں رکھی جا چکی تھیں۔ اس سلسلے میں مزید کیا ہوا، یہ آپ کتاب کے پہلے باب میں جانیں گے۔ پروفیسر سٹیون وائنبرگ کا انداز بیاں مسحور کن اور زبان سلیس ہے۔

کتاب کا دوسرا باب تھرموڈائنامکس پر ہے۔ اس میں آپ حرارت کے بارے میں جانیں گے۔ چیزیں کیوں گرم ہوتی ہیں اور کیسے ٹھنڈی ہوتی ہیں، کچھ چیزیں جلدی ٹھنڈی کیوں ہو جاتی ہیں؟ اس کا ایٹموں سے کیا تعلق ہے اور یہ تعلق کیسے دریافت ہوا؟ اس سے کائنات کے بارے میں کیا پتا چلتا ہے؟ یہ سب دوسرے باب کا موضوع ہے۔ دو صدیوں کی کہانی ان دو ابواب میں ختم ہو جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں علمی دنیا میں جو دھماکہ ہوا، وہ باقی ابواب کا موضوع ہے۔ کوانٹم تھیوری، نسبیت، نیوکلئر فزکس، وغیرہ پر تیسرے سے ساتویں باب میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ انگریزی متن کے ساتھ ساتھ مختصر ریاضیاتی وضاحتیں شامل کی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں کچھ سوالات بھی دیئے گئے ہیں جن کو حل کر کے قاری مزید بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ جو نوجوان طالب علم معقولات کا شوق رکھتے ہیں وہ ان سوالات کو ضرور حل کریں۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ دوست مل کر اس کتاب پر مباحثہ کریں اور اس کے سوالات کو حل کریں۔

کتاب تین سو دس صفحات میں ختم ہو جاتی ہے۔ آخر میں منابع کی فہرست اور انڈیکس بھی شامل کیا گیا ہے۔ اگر فزکس کے کوئی پروفیسر صاحب یوٹیوب پر اس کتاب کے سلسلہ وار دروس کا اہتمام کر سکیں تو بہت اچھا ہو گا۔ ہر فصل پر پندرہ سے تیس منٹ کے دورانیے کا مختصر درس ریکارڈ کرایا جا سکتا ہے۔ اکثر پڑھے لکھے لوگ سائنس پر زبانی گفتگو سے آگے بھی کچھ سننا چاہتے ہیں۔ نیز اس کتاب کے دروس فزکس کے ابتدائی طالب علموں کے ذہن کو مشکل کتابوں کیلیئے ہموار کرنے میں بھی مددگار ہونگے۔ اگر کوئی محترم پروفیسر صاحب سائنس کی کسی کتاب کا اردو ترجمہ کرنا چاہیں تو یہ کتاب ایک بہترین انتخاب ہو گا۔ اردو سائنس بورڈ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔

2. جہلِ مرکب کیا ہے؟

جدید تعلیم کا بنیادی مقصد انسانوں کو علم اور جہلِ مرکب میں فرق کرنے کا فن سکھانا ہے۔ ''پڑھا لکھا جاہل'' کی اصطلاح اکثر ایسے لوگوں کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے جن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تو ہوتا ہے اور اس سے منظم اور مربوط جملے بھی بنا لیتے ہیں لیکن ان کے پاس علم نہیں ہوتا۔ وہ صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں ہوتے، چاہے یہ لوگ بہت اچھی اردو، یا انگریزی یا عربی تحریریں لکھ سکتے ہوں اور عام لوگوں پر لفاظی کی دھاک بھی بٹھا سکتے ہوں۔ عالم ہونے کے لیے صرف زبان جاننا کافی نہیں ہوتا۔ اس علم نما جہالت کے لیے جہلِ مرکب یا شبہ علم (pseudoscience) کی اصطلاحات رائج ہیں۔ یہ ایسی جہالت ہے جس میں مبتلا شخص کو اپنے جاہل ہونے کا علم نہ ہو۔ اس جہالت کی واضح ترین مثال علومِ غریبہ ہیں، جن کی مدد سے لوگوں کو اعداد یا حروف یا ستاروں کے نام پر بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ اس کا خطرناک ترین پہلو یہ ہے کہ یہ لوگوں کے ایمان کا حصہ بن جاتا ہے۔ اب جبکہ انٹرنیٹ کی ایجاد نے ایسے جہلائے مرکب کے ہاتھوں میں نشر و اشاعت کے جدید وسائل بھی دے دیئے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ جہلِ مرکب کیا ہے۔ ذیل میں اس موضوع پر معروف سائنسی مفکر پروفیسر ماریو بُنگے کے ایک مقالے (What Is Pseudoscience?) کے پہلے حصے کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔[1]

---

[1] Mario Bunge, "What Is Pseudoscience?", The Skeptical Inquirer, Vol. 9, No. 1, pages 36–46, (1984).

سوڈوسائنس کیا ہے؟(پروفیسر ماریو بُنگے)

بہت سے فلسفیوں نے علم اور شبہ علم میں فرق کرنے والی ایک خصوصیت ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔کچھ نے کسی نظریئے پر اہلِ علم کے اجماع کو اس کے علمی ہونے کی دلیل کہا ہے تو کچھ نے تجرباتی تائید کو وہ صفت قرار دیا ہے۔ کچھ نے حقائق کو سمجھنے میں کامیابی کو کسوٹی مانا ہے تو کچھ ابطال پذیری کو معیار سمجھتے ہیں۔ بعض نے علمی طریقہ کار کی پابندی کو علم اور شبہ علم میں فرق کی بنیاد بنایا ہے۔ بات کو سادگی سے کم لفظوں میں سمیٹنے کی یہ سب کوششیں ناکام رہی ہیں۔ علم بہت پیچیدہ مظہر ہے اور اسے ایک واحد صفت کی مدد سے شبہ علم سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔اسی طرح جہلِ مرکب بھی اتنا سادہ نہیں کہ آسانی سے پکڑائی دے۔ جیسا کہ کسی دھات کے ٹکڑے کی فقط چمک یا رنگت کی بنیاد پر اس کو اصلی یا نقلی سونا قرار دینا ممکن نہیں ہوتا بلکہ ان کے علاوہ بھی کچھ آزمائشیں کرنی ہوتی ہیں۔ لٰہذا ہمیں علم کے کسی شعبے کو بھی متعدد امتحانوں سے گزارنا چاہیئے تاکہ ہم اس کے حقیقی علم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر سکیں۔ ہم سائنس اور سوڈو سائنس کو معرفت کے دو مختلف میدانوں کے طور پر پرکھیں گے تاکہ ان کے حقیقت یا سراب ہونے کی فہم حاصل کر سکیں۔ معرفت کے میدان سے مراد کسی علم کے حصول اور اس کو وسعت دینے یا استعمال میں لانے کے لیے انسان کی کوشش ہے، چاہے یہ حقیقی علم ہو یا علم کے نام پر دھوکہ ہو۔ موجودہ ثقافتوں میں علم کہلانے والی سینکڑوں چیزیں ہیں۔ایک طرف منطق ہے تو دوسری طرف مذہبی فلسفے کی مباحث ہیں،ایک طرف ریاضی ہے تو ساتھ علم الاعداد بھی ملتا ہے،

فلکیات ہے تو جنتریوں والا علمِ نجوم بھی ہے، کیمسٹری اور الکیمی، نفسیات اور مابعد نفسیات، جامعہ شناسی بمقابلہ حضوری سماجیات، وغیرہ وغیرہ۔

معرفت کے میدان

علم کا کوئی شعبہ سچائی یا طاقت، فہم یا قبولیت تک پہنچنے میں کامیاب ہو یا نہ ہو سکے، اس کی کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس میں اور باقی علوم میں مشترک ہوتی ہیں۔ یہ دس کا گروہ ہیں:

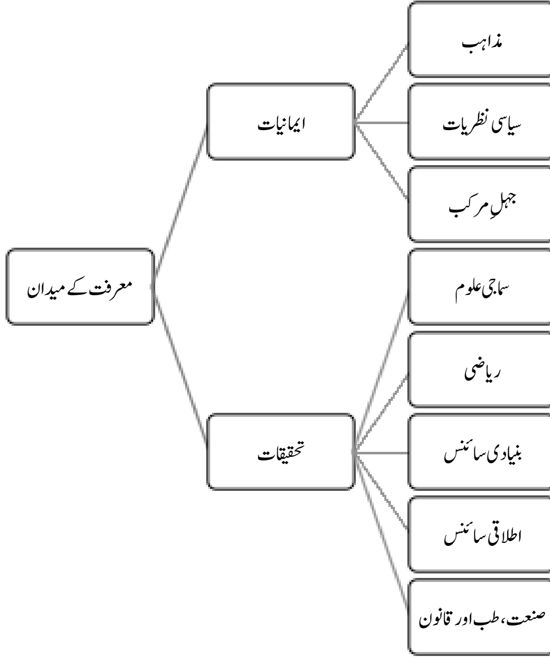
E = (C, S, D, G, F, B, P, K, A, M)

یہاں:

E سے مراد علم کا شعبہ یا میدان ہے۔ یہ دس ارکان سے تشکیل پاتا ہے C : سے مراد اہلِ علم کا حلقہ (cognitive community) ، S سے مراد وہ معاشرہ جس میں وہ اہلِ علم رہتے ہیں (society hosting C) ، D سے مراد معرفت کے میدان کا موضوع ہے (domain or universe of discourse of E, the object E is about)، G سے مراد ان اہلِ علم کا تصورِ کائنات ہے (general outlook or worldview or philosophy of the C's)، F سے مراد اس علم کا ڈھانچہ ہے، یعنی اس علم میں استعمال ہونے والے منطقی اور ریاضیاتی طریقے (formal background: logical and mathematical tools employable in E)، B سے مراد اس علم کا

پس منظر ہے، یعنی وہ مفروضے جو کسی اور علم سے لے کر اس علم کے موضوع کی تشکیل کی گئی ہے (specific background, or set of presuppositions about D borrowed from fields of knowledge other than E)، P سے مراد وہ سوال ہیں جن کا جواب یہ علم دیتا ہے (problematics, or set of problems E may handle)، K سے مراد معلومات کا وہ خزانہ ہے جو اس علم نے پیدا کیا ہے (specific fund of knowledge accumulated by E)، A سے مراد اہلِ علم کے اپنے شعبے میں کام کرنے کے اہداف و مقاصد ہیں (aims or goals of the C's in cultivating E) اور M سے مراد تحقیق کا اسلوب (methodics or collection of methods utilizable in E) ہے۔

معرفت کے میدان کسی ہموار خطے میں نہیں ہیں۔ در حقیقت معرفت کے میدانوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تحقیق کے میدان اور دوسرا ایمانیات کے میدان۔ اگرچہ تحقیق کے میدانوں میں نئی تحقیق کی روشنی میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے، ایمانیات کے میدان میں تبدیلی یا تو وحی کے ذریعے آسکتی ہے، یا کسی تنازعہ کی صورت میں اور یا طاقت کے اندھا دھند استعمال سے لوگوں کا عقیدہ بدلا جاتا ہے۔ یہ تقسیم تصویری شکل میں بیان کی گئی ہے:



علم کیا ہے؟

اب ہم علم کی تعریف کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ علم کا کوئی شعبہ، جیسے طبعیات، حیاتیات یا جامعہ شناسی، ہمارا معرفت کا میدان E ہے۔ یعنی:

$E = (C, S, D, G, F, B, P, K, A, M)$، جبکہ:

E کے سب ارکان آزاد تحقیق کی وجہ سے ارتقاء پذیر ہوتے ہوں، چاہے یہ تبدیلی آہستہ ہوتی ہو۔ یہ تبدیلی اسی میدان میں ہونے والی تحقیقات کے علاوہ دوسرے متعلقہ میدانوں میں ہونے والے کام سے بھی متاثر ہوتی ہو۔

C، یعنی اس کا علمی حلقہ، تربیت یافتہ اور متخصص شخصیات پر مشتمل نظام ہو جس میں پائیدار رابطوں کے ذریعے معلومات کا تبادلہ ہوتا ہو اور وہ تحقیق کی روایت کا آغاز کرنے اور اسے جاری رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

معاشرہ، S، جس میں وہ اہلِ علم اپنا کام کرتے ہیں، وہ ان کے کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، یا کم از کم اسے برداشت کرتا ہے۔

علم کا موضوع، D، خارجی حقائق تک محدود ہوتا ہے، چاہے ماضی کے ہوں، یا حال و مستقبل سے تعلق رکھتے ہوں۔

اس علم کی کلی تصویر اور فلسفہ، G، ایک تو یہ کہتا ہے کہ حقیقی دنیا ایسے واقعی مظاہر سے تشکیل پاتی ہے جن میں کچھ ضوابط کے تحت تبدیلیاں آتی ہیں اور ایسا نہیں کہ عالم ایسی چیزوں سے تشکیل پایا ہو جو بدل نہ سکتی ہوں یا بدلیں تو کسی ضابطے کے بغیر غیبی طاقتوں کی وجہ سے بدلتی ہوں۔ دوسرے اس کی علمیات، یعنی علم کا تصور، حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ تیسرے اس میں شفافیت، دقیق ہونا، گہرائی، تسلسل و ثبات اور سچائی جیسی اقدار پائی جاتی ہیں اور اس تصورِ کائنات میں سچائی کی آزادانہ تلاش کی روح پائی جاتی ہے۔

علم کا ڈھانچہ، F، جدید منطقی اور ریاضیاتی اصولوں سے تشکیل پاتا ہے۔ نہ تو کھوکھلا ہوتا ہے اور نہ ہی فرسودہ منطق اور قدیم ریاضی میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔

علم کے بنیادی مفروضے، B، عصری پیشرفت سے ہم آہنگ، معقول اور تصدیق شدہ معلومات اور نظریات سے تشکیل پاتے ہیں جو معرفت کے متعلقہ میدانوں سے مستعار لیے گئے ہوتے ہیں۔

علم جن سوالوں کا جواب ڈھونڈتا ہے، P، وہ موضوع، D، کی طبیعت کے اصولوں کی شناخت پر تمرکز کے ساتھ E میں موجود باقی چیزوں تک محدود ہوتے ہیں۔

علم کا پیدا کردہ معلومات کا خزانہ تازہ اور قابلِ تصدیق نظریات، معلومات اور مفروضات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو علم کے بنیادی مفروضوں، B، کے ساتھ اور E کے باقی ارکان سے سازگار اور موافق ہو چکا ہوتا ہے۔

اہلِ علم کا مقصد، A، علم کے موضوع، D، کے قوانین کی دریافت اور ان کا استعمال ہوتا ہے۔ نیز مفروضوں کو منظم انداز میں آگے بڑھا کر پختہ نظریات بنانا اور تحقیق کے طریقوں، M، کی اصلاح کرنا ہوتا ہے۔

تحقیق کا طریقۂ کار یا اسلوب، M، صرف قابلِ فہم اور قابلِ توجیہ روش پر مبنی ہوتا ہے۔ صرف انہی طریقوں تک محدود رہا جاتا ہے جن کے درست ہونے کو پرکھا جا سکے، ان کا تجزیہ کیا جا سکے اور ان پر تنقید کی جا سکے۔

E ایک وسیع علمی افق سے تعلق رکھتا ہو، یعنی اس کے علاوہ تحقیق کا کم از کم ایک اور ایسا میدان، É، ہو کہ: (الف) اس کا تصورِ کائنات، اس کے منطقی اور ریاضیاتی اصول، اس کے بنیادی مفروضے، اس کی پیدا کردہ معلومات، اس کے مقاصد اور اس کا اسلوبِ تحقیق اس سے کسی حد تک ملتا ہو اور (ب) یا تو ان دونوں کے موضوعات میں کوئی ربط ہو یا اس کے موضوعات دوسرے میدان کے ارکان میں آتے ہوں۔

کوئی تحقیق کا میدان جو ان بارہ شرائط کو پورا نہ کرتا ہو اسے غیر علمی کہا جا سکتا ہے۔ اسکی ایک مثال مذہبی فلسفے یا ادب پر تنقید کا کام ہے۔ اور کوئی ایسا معرفت کا شعبہ جو علمی نہ ہو مگر اسے علم قرار دیا جا رہا ہو تو وہ جہلِ مرکب ہو گا۔ قاری کو خود اپنے پسندیدہ علم کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہئیے کہ وہ ان بارہ شرائط پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟

جہلائے مرکب	اہلِ علم	عمومی رویے اور سرگرمیاں
نہیں	ہاں	1. اپنی جہالت کا اقرار کر کے تحقیق کی ضرورت محسوس کرتے ہیں
نہیں	ہاں	2. انہیں اپنا علم سیکھنے میں دشواری ہوتی ہے اور اس میں نقائص نظر آتے ہیں
نہیں	ہاں	3. آگے بڑھنے کیلئے نئے سوالات کی ضرورت ہوتی ہے
نہیں	ہاں	4. نئے مفروضات اور طریقوں کو پسند کرتے ہیں
کبھی کبھار	ہاں	5. نئے مفروضے اور اسالیب پیش کرتے ہیں
نہیں	ہاں	6. قوانین تلاش کرنے اور ان کے اطلاق کی کوشش کرتے ہیں
نہیں	ہاں	7. وحدتِ علوم پر یقین رکھتے ہیں
کبھی کبھار	ہاں	8. منطق کو استعمال کرتے ہیں
کبھی کبھار	ہاں	9. ریاضی کو استعمال کرتے ہیں
کبھی کبھار	ہاں	10. اعداد و شمار اکٹھے کرتے ہیں
نہیں	ہاں	11. مفروضوں کے رد میں کوئی مثال لانے کی کوشش کرتے ہیں
نہیں	ہاں	12. نظرِ ثانی کیلئے کوئی غیر جانبدارانہ طریقہ دریافت یا استعمال کرتے ہیں
نہیں	ہاں	13. اختلافِ رائے کے خاتمے کیلئے تجربے یا ریاضی کا استعمال کرتے ہیں
ہاں	نہیں	14. بار بار شخصیات کا حوالہ دیتے ہیں
ہاں	نہیں	15. ناموزوں حقائق کو مسخ کرتے یا چھپا دیتے ہیں
نہیں	ہاں	16. موضوع کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں

17. دوسروں سے تنقیدی تبصروں کی درخواست کرتے ہیں	ہاں	نہیں
18. آسان زبان میں مضامین لکھتے ہیں	نہیں	ہاں
19. عوام میں فوری مشہوری کا امکان	نہیں	ہاں

3. نیوٹن کا مقام ملا صدرا سے بلند کیوں ہے؟

آج مسلم ممالک کی جو حالت ہے اس کا سب سے بڑا سبب ہمارے ہاں رائج پرانے یونانی اور ہندی علوم کا واقعیت سے دور ہونا ہے۔ ان نام نہاد علوم کو جہل مرکب بھی کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان مغربی اقوام کی غلامی میں اسلئے گئے کہ ان کی تعلیم ان کی عقلوں کو کمزور رکھتی تھی۔ ہمارے ہاں اول تو درسگاہیں بہت کم تھیں اور ننانوے فیصد لوگ ان پڑھ ہوتے تھے، دوسرے ان درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے علوم مغربی علوم سے بہت پیچھے تھے۔ علمی دنیا میں ہم نے شکست کھائی تو ہم پر مغرب کا ظاہری قبضہ ہوا، جو اب تک جاری ہے۔ مولوی صاحبان کا یہ کہنا کہ مغرب کے ہاتھوں شکست کی وجہ عیاش حکمران تھے اور ہیں، غلط ہے۔ کرپشن نقصان دہ ہوتی ہے لیکن علمی پسماندگی کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے اب تک اکثر لوگ یونانی خیالات کے اسیر ہیں اور نہ صرف کائنات اور معاشرے، بلکہ خود انسان اور مذہب کو بھی پرانی یونانی عینک سے دیکھتے ہیں۔

حرکت کا قدیم تصور

حرکت کا موضوع ہمیشہ سے انسانوں کے درمیان موضوع بحث رہا ہے کیونکہ انسان ہمیشہ تبدیلیوں میں گھرا رہتا ہے۔ صنعتی ترقی کی بنیاد حرکت کو سمجھنے پر ہے۔ ماضی میں جو لوگ وحدت الوجود کے خیال کے اسیر ہوئے انہوں نے اس سے حرکت کی وضاحت بھی نکالنا چاہی۔ یہ قدیم خیال حرکتِ جوہری کہلاتا ہے جس کے مطابق محرک، حرکت اور متحرک اصل میں ایک ہیں۔ یعنی جوہر خود ہی حرکت ہے، متحرک چیزیں اپنی محرک خود ہیں۔ یہ

خیال فرسودہ یونانی فلسفے سے ہوتا ہوا ملا صدرا تک آیا۔ افسوس کی بات ہے کہ اس کو سمجھے بنا آئن سٹائن وغیرہ کے نہایت نفیس کام پر بھی بعض جوشیلے شیعہ خطیبوں کی طرف سے حرکتِ جوہری کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس مضمون سے یہ معلوم ہو گا کہ ملا صدرا صاحب تو نیوٹن کے ساتھ ملائے جانے کے قابل بھی نہیں ہیں، کجا یہ کہ انہیں آئن سٹائن کے برابر کھڑا کر دیا جائے۔

حرکت کا جدید تصور

جدید سائنس بدیہیات کی درست تفہیم کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ حرکت کے جدید تصور کی بنیاد ہی یونانی تصورات کے بطلان پر ہے اور جدید ٹیکنالوجی محرک، حرکت اور متحرک میں فرق کو سمجھنے پر استوار ہے۔ جدید سائنس کے مطابق حرکت یا اس میں تبدیلی کسی جسم پر عمل کرنے والی خارجی طاقتوں (forces) کے توازن کے بگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ خارجی طاقت توانائی (energy) میں فرق آنے سے پیدا ہوتی ہے، یہ فرق نہ ہو تو طاقت پیدا نہیں ہوتی۔ توانائی کا یہ فرق ہی حرکی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے اور حرکت کو بقا کے لیے محرک کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن تبدیلی کے لیے طاقت کا عمل دخل لازمی ہے۔ زندہ اجسام میں تبدیلیاں بھی ان کے اجزاء کی مکانی حرکت کا اظہار ہوتی ہیں، جو ان اجزاء کے ماحول میں پیدا ہونے والی کیمیائی طاقتوں کے زیر اثر آتی ہیں۔ غذا، پانی اور آکسیجن وغیرہ انہی طاقتوں کو پیدا کرنے کے کام آتی ہیں۔ جاندار جسم یہ چیزیں اپنے باہر کے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ ماضی میں جسے جوہر کہہ کر فرضی باتیں کی جاتی تھیں وہ

اشیاء کی کیمیائی ترکیب ہوتی تھی، یہی ترکیب اعراض متعین کرتی ہے۔ یونانی اسے نہیں جانتے تھے۔

یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اشیاء کی ترکیب ہر وقت اور مسلسل تبدیلی کے عمل سے نہیں گزرتی۔ مثلاً اگر لوہے کو زنگ نہ لگے تو اس کی کیمیائی ترکیب یا جوہر تبدیل نہیں ہو گا۔ جب زنگ لگنا شروع ہو تو صرف اسی مقام پر جوہری تبدیلی ہو گی جہاں زنگ لگا ہے۔ جب زنگ لگنے کا عمل ختم ہو تو کیمیائی ترکیب میں تبدیلی رک جائے گی۔ اسی طرح سونے کی بنی چیزیں تو صدیوں تک کسی تبدیلی سے دوچار نہیں ہوتیں۔ ہاں زندہ چیزوں میں مسلسل توانائی خرچ ہوتی رہتی ہے تو تبدیلی ایک تسلسل سے جاری رہتی ہے۔ سب چیزوں کے مسلسل سیال کی طرح بہتے رہنے کا یونانی تصور کم علمی پر مبنی تھا۔

جدید سائنس کا نظریۂ حرکت بہت گہرا اور مفصل ہے۔ حرکت سائنس کے بنیادی موضوعات میں سے ہے۔ لائبریریوں تک جانے کے بجائے اگر ملک بھر میں کتب فروشوں کے ہاں بکتی سائنس و ٹیکنالوجی کی نصابی کتابوں کے حجم اور تعداد کو ہی دیکھ لیا جائے تو یہ جاننا کافی ہو گا کہ نیوٹن (متوفی 1727ء) کے بعد حرکت کی فہم میں کس قدر پیشرفت ہو چکی ہے۔ آج کوئی بھی ملک نیوٹن کی تحقیقات اپنے بچوں کو سکھائے بنا جدید طرز زندگی کو برقرار رکھنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ کسی اور ملک کی کیا بات کی جائے، خود ایران کی صنعت میں بھی سائنسی نظریۂ حرکت استعمال ہو رہا ہے۔ ایران کی انجینئرنگ

یونیورسٹیوں میں مغربی سائنسدانوں کی کتب کے تراجم ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ وہاں بھی حرکت جوہری کا تصور صرف مدرسوں یا اسلامیات کے شعبوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

نیوٹن کے قوانین

نیوٹن نے حرکت کے تین قوانین بتائے، لیکن پہلا اور تیسرا اصل میں دوسرے قانون کی ہی وضاحت ہیں۔ دوسرا قانون ایک مساوات کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے:

$$F = ma$$

یہاں F سے مراد خارجی محرک یا طاقت (Force) ہے۔ m سے مراد مادے کی مقدار یا کمیت ہے جسے کلو گرام کے حساب سے ماپا جاتا ہے۔ ہر وہ چیز مادہ ہے جو کسی مکان و زمان میں ہو۔ یعنی جگہ گھیرتی ہو یا حرکت کرتی ہو۔ مادے کی مقدار کا تعین ان ذرات سے ہوتا ہے جن سے مل کر کوئی چیز بنی ہوتی ہے۔ مثلاً لوہے کی چیز میں مادہ زیادہ ہو گا اور اس کے مساوی حجم رکھنے والی لکڑی کی چیز میں کم ہو گا۔ a سے مراد حرکت میں تبدیلی کی شرح ہے، چاہے رفتار کی مقدار بدلے یا اس حرکت کا رخ بدلے۔ ان دو کا حاصلِ ضرب طاقت (force) کے مساوی ہے۔ جتنی طاقت زیادہ لگے گی، اتنی رفتار میں تیزی سے ہو گی۔ ان تینوں مقداروں کو اعداد کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔ جب کوئی بات اعداد کی مدد سے بیان ہو تو اس کے معنی میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔

اسی مساوات سے پتا چلتا ہے کہ اگر کوئی چیز حرکت کر رہی ہے تو وہ اس وقت تک سیدھے خط میں چلتی رہے گی جب تک اس پر کوئی طاقت اثر نہ کرے۔ جب کوئی طاقت اثر کرے گی تو وہ اسے روک کر اس کی حرکت ختم بھی کر سکتی ہے۔ ساکن چیز تب تک حرکت نہ کرے گی جب تک اس کو کوئی خارجی طاقت حرکت پر مجبور نہ کرے۔ یہ پہلا قانون حرکت ہے۔ یہ عام مشاہدہ بھی ہے اور ملا صدرا نے بھی کہا ہے کہ ہر مستقیم حرکت کی انتہاء بالآخر سکون پر ہو گی [1] لیکن وہ یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ اس کو ختم کرنے کے لیے اس کی عددی مقدار کے متناسب خارجی طاقت لگنا ضروری ہے، ورنہ یہ حرکت جاری رہے گی۔ نہ ہی وہ یہ بات سمجھے کہ خطِ مستقیم کے علاوہ کسی اور راستے پر حرکت کے لئے مسلسل طاقت خرچ ہونا ضروری ہے، چاہے وہ دائرے میں حرکت ہو، بیضوی حرکت ہو یا کسی اور صورت میں ہو۔

اسی مساوات سے پتا چلتا ہے کہ اگر کسی چیز پر عمل کرنے والی طاقت کے اثر کو ختم کرنا ہے تو ردعمل اس کے مساوی لیکن الٹے رخ میں ہو تا کہ

$$F-F=0$$

کے مطابق کل طاقت صفر ہو جائے۔ یہ تیسرا قانون حرکت ہے۔

---

[1] فلسفۂ ملا صدرا، صفحہ 702، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

کیلکولس کی ایجاد

نیوٹن نے حرکت کو دقت کے ساتھ بیان کرنے کیلیئے ایک نئ قسم کی ریاضی (Calculus) بھی ایجاد کی تاکہ معنوں کے ابلاغ میں کوئی ابہام نہ رہے۔ یہی ریاضی ایک اور انداز میں اس کے جرمن معاصر لائبنیز نے بھی ایجاد کی تھی۔ آج دنیا بھر میں گیارہویں جماعت کی ریاضی سے کیلکولس سکھانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے تک جاری رہتا ہے۔ مکینکس کی کتابوں میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ اب تو یہ ریاضی دریاؤں میں پانی کے بہاؤ، موسمیات، بجلی کی پیداوار، کمپیوٹر اور آئی ٹی، صحت عامہ کے مسائل، معیشت کی منصوبہ بندی وغیرہ کو سمجھنے میں بھی استعمال ہو رہی ہے۔ کوانٹم فزکس اور کوانٹم کیمسٹری کی زبان یہی ریاضی ہے۔ اس کو سیکھے بغیر اکثر جدید علوم میں تحقیقی کام ممکن نہیں رہا۔

کشش ثقل کا اصول: طبیعیات اور ہیئت کا اتحاد

نیوٹن نے ہی کششِ ثقل (gravity) کو دریافت کیا اور اب اس کو بھی ریاضی کی مساوات میں بیان کیا جاتا ہے۔ نیوٹن سے پہلے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ پتھر خود پہاڑ سے نیچے آتا ہے، گویا حرکت اس کے اندر ہو۔ ملا صدرا لکھتے ہیں:

"بعض اوقات اتفاقی اسباب کی غایت بھی ذاتی غایت ہی ہوتی ہے۔ مثلاً اوپر سے گرنے والا پتھر اگر پانی میں تیرنے کے بعد اس جگہ پر پہنچے جہاں گر کر پہنچنا چاہتا تھا، یعنی جو اس کی

ذاتی غایت تھی وہاں پہنچے۔ کبھی صرف اتفاقی اسباب پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہی تیرنے والا پتھر اگر کسی وجہ سے سطحِ آب پر ٹھہرا رہے۔ پہلی صورت میں اتفاقی اسباب کو طبعی غایت کے اعتبار سے ذاتی سبب کہتے ہیں اور عرضی غایت کی رو سے اتفاقی سبب، اور دوسری صورت میں ذاتی غایت کے اعتبار سے ان اتفاقی اسباب کو باطل اور غیر مثمر اسباب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔[1] "

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملا صدرا تیرنے والی چیزوں کے بارے میں اپنے سے ڈیڑھ ہزار سال قبل گزرنے والے ارشمیدس کے کام سے بھی ناواقف تھے۔ پرانے لوگ یہ بھی خیال کرتے تھے کہ جو چیز اوپر پھینکی جائے اسے ہوا نیچے دھکیل دیتی ہے ورنہ وہ تو آسمان پر پہنچ جائے۔ مثلاً ابن سینا کا کہنا تھا:

"اگر اس ہوا کی طرف سے رکاوٹ نہ پیدا ہو جسے پتھر پھاڑ کر اوپر جاتا ہے اور اسی رکاوٹ کی وجہ سے چڑھاؤ کا جو میلان پتھر میں پیدا ہو گیا تھا کمزور پڑتا جاتا ہے اگر یہ مقابلہ درمیان میں پیش نہ آتا، تو جو پتھر اوپر کی طرف پھینکا جاتا ہے وہ آسمان کی سطح سے ٹکرانے کے بعد ہی واپس ہوتا۔[2] "

---

[1] فلسفۂ ملا صدرا، صفحات 476، 477، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018۔

[2] (الف) فلسفۂ ملا صدرا، صفحہ 712، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

(ب) اسفار اربعہ، جلد 3، صفحہ 217، بیروت۔

اس بات کو نقل کرنے کے بعد ملا صدرا نے اس پر جو بے سروپا بحث کی ہے وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ لوگ حرکت کے بارے میں کس قدر ذہنی انتشار کا شکار تھے؟ نیوٹن سے پہلے کیپلر معلوم کر چکا تھا کہ سیاروں کے مدار بیضوی تھے۔ نیوٹن کے کام نے اس کی بنیادیں بھی پختہ کر دیں۔ سیاروں کے مدار کامل دائروں جیسے نہ تھے بلکہ ہر سیارے کا مدار اس کی کمیت اور اس پر عمل کرنے والی ثقلی طاقت کی مناسبت سے مختلف تھا۔ اور اسی وجہ سے نیوٹن سے پہلے تک آسمان کے مشاہدے سے حاصل کئے گئے ڈیٹا اور سیاروں کے مدار کے تصور میں تضاد رہتا تھا، جس سے کیلنڈر میں ترمیم کی ضرورت پڑا کرتی تھی۔ پہلے لوگ بلاوجہ یہ سمجھتے تھے کہ دائرہ کامل ترین شکل ہے اور اجرام فلکی کیلئے عقلی طور پر واجب ہے کہ دائروں میں حرکت کریں۔ ملا صدرا کہتے ہیں:

"عرضی مقولوں میں جو حرکتیں واقع ہوتی ہیں ان میں سب سے مقدم ترین حرکت وہ حرکت ہے جس کا نام حرکت وضعی دوری ہے، یعنی عام طور پر جسے گردش اور چکر کہتے ہیں۔ اور یہ کہ صرف قدیم ہی نہیں بلکہ تمام حرکتوں میں اشرف اور کامل تر حرکت بھی یہی ہے۔[1] "

نیوٹن سے پہلے آسمان کی چیزوں کو زمین پر موجود چیزوں سے الگ خیال کیا جاتا تھا اور علم ہیئت میں آسمان کی چیزوں کے بارے بات کرتے تھے جبکہ طبیعیات میں زمین کی چیزوں پر

---

[1] فلسفۂ ملا صدرا، صفحہ 644، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

بات کی جاتی تھی۔ یہ فرق تو گلیلیو نے مٹا دیا تھا لیکن نیوٹن کے کشش ثقل کے اصول نے اس اتحاد کو پختہ بنیاد فراہم کی۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ جس اصول سے پتھر پہاڑ سے گرتا ہے وہی اصول چاند کو زمین کے گرد چکر کاٹنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس کے علاوہ نیوٹن کا ایک اہم کام روشنی کی ماہیت کو سمجھنا بھی تھا۔ روشنی کے بارے میں بھی ملا صدرا متعدد غلط فہمیوں کا شکار ہوئے جس کی طرف آگے ایک مضمون میں اشارہ کیا جائے گا۔

ماضی قدیم میں کم علمی کی وجہ سے فلسفیوں کا حرکتِ جوہری وغیرہ پر یقین رکھنا قابل فہم ہے، لیکن اب ہم اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں تو اس قسم کی باتوں پر ہٹ دھرمی دکھانا درست نہیں ہے۔ اب انٹرنیٹ سے جدید سائنس سیکھ کر اس غلط فہمی سے باہر آنا ممکن ہے۔ اب تو جدید علم اتنا واضح و روشن ہو گیا ہے کہ ایٹموں سے چھوٹے ذرات کی حرکت کو بھی ریاضی کی زبان میں بیان کیا جا چکا ہے، اس کی تفصیل موجودہ مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔

4. ایٹم کے بارے میں ملا صدرا کے خیالات

جدید سائنس کا یہ کہنا ہے کہ چیزیں مالیکیولز سے مل کر بنی ہوتی ہیں۔مالیکیولز کو ایٹمز تشکیل دیتے ہیں۔ مالیکیولز تو کروڑوں اقسام کے ممکن ہیں، جبکہ ایٹموں کی اقسام ایک سو سے کچھ اوپر ہیں۔ ایٹم کے بارے میں درست معلومات حاصل کرنے میں مغرب کے محققین کی بہت محنت صرف ہوئی ہے۔ آج کل بعض غالی قسم کے خطیب ان معلومات تک رسائی کا کریڈٹ بھی ملا صدرا کو دے دیتے ہیں، جو درست نہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایٹم کی سمجھ میں سبھی مسلم فلاسفہ کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں پہلے ایک مختصر تاریخچہ پیش کر کے پھر ملا صدرا کی اپنی عبارات بمع حوالہ جات پیش کی جائیں گی تاکہ قارئین کرام اپنی آنکھوں سے ملا صدرا کا موقف پڑھ کر اس غلط فہمی سے نجات حاصل کر سکیں۔

تعارف

ایٹم کا لفظ یونانی زبان سے نکلا ہے اور اس کا مطلب ناقابل تقسیم ہونا ہے۔ دی مقراطیس (متوفی 370 قبل مسیح) کا خیال تھا کہ دنیا کی چیزیں ناقابل تقسیم ذرات سے بنی ہیں۔ آج بھی عام لوگ یہ بات سمجھتے ہیں کہ کسی اینٹ کو اگر توڑتے جائیں تو آخر میں مٹی کے بہت چھوٹے ذرات رہ جائیں گے جنہیں مزید توڑنا ممکن نہ ہو گا۔ اگرچہ مٹی کے ذرات کو ناقابل تقسیم سمجھنا درست نہیں ہے۔

دی مقراطیس (Democritus) کی بات پرانے دور کی زبان کی محدودیت اور خیالات کی پراکندگی کے ہمراہ تھی۔ دی مقراطیس اوراس کے ساتھیوں اور پیروکاروں کے ایٹم کے تصور کی تفصیلات درست نہ تھیں اور انہوں نے اس بنیاد پر مظاہر فطرت کی جو توجیہ پیش کی وہ غلط تھی۔ جیسا کہ افلاطون اور ارسطو کی اکثر باتیں بھی غلط تھیں۔ البتہ ان لوگوں کی اصل قدر و قیمت اس میں ہے کہ انہوں نے اپنے تئیں ٹھیک سوچنے اور کائنات کی درست تشریح کرنے کی کوشش کی۔ ان کی باتوں کو یاد کرلینا درست نہیں، لیکن ان کی روش اور سچائی کو پانے کی تڑپ کو سراہا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد ایٹم کے بارے میں دو ہزار سال تک کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی میں جان ڈالٹن نے یہ دیکھا کہ مرکبات کے آپس میں ری ایکشن سے جو نئے مرکبات بنتے ہیں ان کے وزن میں فرق چند مخصوص اعداد کی صورت میں ہوتا ہے۔ گویا ان کا وزن مخصوص باٹوں کی صورت میں بدلتا ہو، یہ اضافہ مسلسل نہ ہو بلکہ وزن یکدم ایک درجے سے دوسرے درجے پر جاتا ہو، جیسے ایک کے بعد دوسری سیڑھی چڑھی جاتی ہے۔ ان باٹوں کا نام اس نے دی مقراطیس سے لفظ مستعار لے کر ایٹم رکھا۔ یہ صرف لفظی اشتراک تھا، بظاہر ایک جیسی اصطلاحوں کے معنی الگ الگ تھے۔ 1803ء میں ڈالٹن نے کیمسٹری کا ایک قانون تجویز کیا جس کے مطابق ایسے مرکبات جو دو الگ الگ عناصر پر مشتمل ہوں، ان میں عناصر کی مقدار کا تناسب چھوٹے مکمل اعداد (integers) کی

صورت میں ہو گا۔ چار سال بعد ہی اس کا مشاہدہ بھی کر لیا گیا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب عراق کے شہر نجف پر نجد کے وہابی لشکر نے حملہ کیا تھا۔

یہ دیکھا جا رہا تھا کہ بعض اوقات مختلف صفات والے مرکبات اصل میں ایک جیسے عناصر کی ایک جیسی مقدار اور تناسب سے بنے ہوتے ہیں۔ 1860ء میں لوئی پاسچر نے بتایا کہ اصل میں ان کی ترکیب مختلف ہوتی ہے جس کی وجہ سے تشکیل پانے والے مالیکیولز مختلف ہوتے ہیں۔ 1867ء میں مینڈلیو نے عناصر کا جدول تیار کیا، ہر عنصر اپنے ایٹم کے وزن کے حساب سے درست مقام پر رکھا گیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک جدید کیمسٹری کی بنیادیں تیار ہو چکی تھیں۔ اب کیمسٹری اور فزکس کے اتحاد کی طرف قدم بڑھنے لگے۔ 1899ء میں جے جے تھامسن نے ایٹم کے اندر پایا جانے والا نیا ذرہ دریافت کیا جس کا نام الیکٹران رکھا گیا۔ 1911ء میں ردرفورڈ نے نیوکلیئس دریافت کیا، جو ہر ایٹم کے مرکز میں ہوتا ہے اور ایٹم کا زیادہ تر مادہ اسی میں ہوتا ہے۔ یہ نیوکلیئس (ہستہ) بھی پروٹانز اور نیوٹرانز سے مل کر بنا ہوتا ہے۔ 1912ء میں بوہر نے بتایا کہ الیکٹران نیوکلیئس کے گرد مخصوص مداروں میں ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ اب معلوم ہو چکا تھا کہ ایٹم مرکب اور قابل تقسیم ہوتا ہے۔ اب ایٹموں کے ڈھانچے کے خدوخال اعداد کی شکل میں بیان کئے جانے لگے اور مینڈلیو کے جدول کی توجیہ ممکن ہو گئی۔ ادھر سیاست کی دنیا میں جنگ عظیم اول چھڑ گئی اور انتہا پسندی نے علم و تہذیب کے سفر کو سست کر دیا۔

ایٹم کی سمجھ میں ایک بڑی پیشرفت تب ہوئی جب 1926ء میں شوڈنگر نے اپنی مشہور زمانہ مساوات پیش کی جس کی مدد سے اشیاء کے اعراض کی وضاحت ان کو تشکیل دینے والے مالیکیولز کی بنیاد پر کی جانے لگی۔ کیمسٹری کی بنیاد کوانٹم فزکس میں ڈھونڈی جا چکی تھی۔ یہ اس پر پیچ سفر کی ایک مختصر داستان ہے۔

ملا صدرا کیا کہتے تھے؟

ملا صدرا (متوفی 1640ء) نے ایٹم کے بارے میں ہمارے علم میں کوئی اضافہ کرنے کے بجائے دیمقراطیس کے خام قسم کے ابتدائی خیال کی بھی مخالفت کی ہے۔ ان کی کتاب اسفار اربعہ میں یہ لکھا ہے:

"اتصالی وحدت حقیقی وحدت کی ایک قسم ہے۔ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو چیز اتصالی وحدت رکھتی ہے اس کو موضوع کے اعتبار سے بھی واحد ہی ہونا ضروری ہے۔ یعنی اس کی تقسیم مختلف صورتوں کی طرف نہیں بلکہ ایسے اجزاء کی طرف ہونی چاہئے جو اپنی حقیقت میں متحد ہوں اور جن کا وجود بالفعل نہیں بلکہ بالقوہ ہوتا ہے، جیسا کہ عنقریب اس پر بحث آئے گی۔ اور چونکہ یہ بھی ایک بدیہی مقدمہ ہے کہ جس میں وحدت بالفعل ہو گی اس کی کثرت بالقوہ ہو گی، اس کے بعد یہ دعویٰ کہ جس چیز کی وحدت اتصالی ہوتی ہے ایسے

وحدانی متصل کے اجزاء کا صورتوں کے لحاظ سے مختلف ہونا ممکن ہے، نہایت بیہودہ بات ہے۔"[1]

یہ سب خیال بافی ہے۔آگے ایک اور جگہ دیمقراطیس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"دی مقراطیس کا خیال ہے کہ عالم کا وجود محض اتفاق کا نتیجہ ہے، اور اس کی دلیل میں اس کی تقریر یہ تھی کہ عالم کے مبادی (ابتدائی اجزا) ایسے چھوٹے چھوٹے اجرام وذرات ہیں جن کی ان کی سختی کی وجہ سے تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ یہ ذرات اس خلاء اور فضا میں جو غیر محدود ہے، بکھرے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان ذروں کی فطرت اور طبیعت تو واحد ہے، یعنی طبیعت میں سب ایک ہیں لیکن ان کی شکلیں مختلف ہیں اور وہ ہمیشہ دائمی حرکت اور گردش کے ساتھ متحرک رہتے ہیں۔ اتفاقاً انہی ذرات کے کسی مجموعے کی دوسرے مجموعے کے ساتھ مٹ بھیڑ ہو گئی، اور ایک خاص شکل میں وہ اکھٹے ہو گئے۔ اس سے عالم کی پیدائش ہوئی۔ عالم کے متعلق اگرچہ دی مقراطیس اسی خیال کا قائل تھا، لیکن اسی کے ساتھ حیوانات و نباتات کی پیدائش کے متعلق وہ اتفاق کا مدعی نہ تھا۔"[2]

---

[1] (الف) مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، ترجمۂ اسفار اربعہ، صفحات 362، 363، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

(ب) ملا صدرا، "اسفار اربعہ"، جلد 2، صفحہ 94، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

[2] (الف) مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، ترجمۂ اسفار اربعہ، صفحہ 475، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔(ب) ملا صدرا، "اسفار اربعہ"، جلد 2، صفحہ 253، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

اگلے صفحات پر وہ اس خیال کو رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"پس معلوم ہوا کہ دی مقراطیس اور انباذقلیس کی طرف جو خیالات اس باب میں منسوب ہیں، سب غلط اور بے بنیاد ہیں۔"[1]

ملا صدرا نہ صرف خود دیمقراطیس کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں بلکہ انکا یہ بھی کہنا ہے کہ مشائیوں، یعنی ابنِ سینا وغیرہ نے، بھی اس کو باطل کہا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"مشائیوں نے کیفیتوں کی شدت پذیری اور ضعف انگیزی کے متعلق ثابت کیا ہے کہ یہ حرکت کے جسمانی موضوع و محل سے اس حرکت کا نام ہے جو کیفیات کے مراتب میں واقع ہوتی ہے۔۔۔ان لوگوں نے حکیم دیمقراطیس کی اس رائے کو باطل کرتے ہوئے، جو اجسام کے مبادی کے متعلق ہے، اپنے دعوے کو بدیہی قرار دیا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ جسم کے سیاہ ہونے میں سواد یعنی سیاہی کے جو مختلف مراتب شدت و ضعف کی بنیاد پر پیدا ہوتے ہیں، یہ ماننا پڑے گا کہ تمام مراتب نوعی ماہیت کی رو سے متحد ہیں۔ اور اس میں کوئی محال بات لازم نہیں آتی۔"[2]

---

[1] مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، ترجمۂ اسفار اربعہ، صفحہ 477، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔
ملا صدرا، "اسفار اربعہ"، جلد 2، صفحہ 256، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

[2] مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، ترجمۂ اسفار اربعہ، صفحہ 299، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔
ملا صدرا، "اسفار اربعہ"، جلد 1، صفحہ 437، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

ملا صدرا کی اس کتاب میں کئی مقامات پر دیمقراطیس کا ذکر آیا ہے اور ہمیشہ ملا صدرا نے ایٹم کے تصور کی مخالفت ہی کی ہے۔ یہ کتاب کسی قسم کی ریاضی سے بالکل پاک ہے۔ اہل دانش جانتے ہیں کہ ایٹم کا جدید تصور ریاضی کے بغیر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر یہی ہو گا کہ ایسے لوگوں کے جعلی فضائل گھڑنے کے بجائے اپنی معلومات میں اضافہ کر کے دنیا کو ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

5. علامہ مرتضیٰ مطہری توانائی کے مفہوم کو نہ سمجھ سکے

توانائی (energy) کا لفظ جدید سائنس میں ایک گہرے مفہوم کو بیان کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ نیوٹن کے دوسرے قانون کو طاقت (force) کے بجائے توانائی کی تبدیلی کی شرح کی صورت میں لکھا جائے تو بعض مسائل کا حل آسان ہو جاتا ہے۔ کوانٹم فزکس میں اسی مفہوم کو استعمال کر کے کائنات کو سمجھا گیا ہے۔ اگرچہ فورس کے مفہوم کو استعمال کرنے سے بھی وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

جدید سائنس کے مطابق کائنات توانائی ہی ہے، زمان و مکان بھی اس سے بنے ہیں۔ اس کی کل عددی مقدار مستقل ہے۔ یہ بگ بینگ کی شکل میں خلق ہوئی اور وہ بگ بینگ ابھی بھی جاری ہے، یعنی اس کائنات کے زمان و مکان پھیلتے جا رہے ہیں۔ توانائی کبھی مادے کے بنیادی ذرات تشکیل دیتی ہے، تو کبھی برقی ہے جس کی پیمائش بجلی کے بل کی صورت میں ہوتی ہے۔ ہر قسم کی توانائی کی ماہیت الگ ہوتی ہے۔ کبھی یہ حرارت ہے، کبھی حرکی توانائی ہے، کبھی آواز ہے۔ ہمارے دماغ میں الفاظ و اعداد توانائی کی تراکیب ہیں۔ ہمارا علم انہی الفاظ و اعداد کی شکل میں ہوتا ہے۔ ہمارے حواس سے جو نہایت محدود معلومات ملتی ہیں وہ توانائی کے سگنلز ہوتے ہیں۔ روشنی بھی توانائی کی ایک قسم ہے کہ جس سے بجلی بھی بنائی جا سکتی ہے۔ پودے روشنی سے پرورش پاتے ہیں، اس کو استعمال کر کے ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس اور زمین کی مٹی سے پانی و غذا حاصل کرتے ہیں۔ پودوں میں روشنی اور دیگر ذرات جس کیمیائی توانائی کی شکل میں اکٹھے ہوتے ہیں اسے جانور کھا کر پرورش پاتے ہیں۔

جانور اس کے علاوہ پانی، آکسیجن اور روشنی بھی استعمال کرتے ہیں۔ غرض توانائی مختلف اقسام میں ہوتی ہے۔ جسمانی صورت میں ہو تو اسے مادہ کہتے ہیں، مادے سے روشی بنے تو ایٹم بم میں پھٹ کر شہر نگل سکتی ہے۔اس کی مختلف اقسام مل کر کسی اور قسم میں تبدیل ہو سکتی ہیں، جیسے ریڈیو میں بجلی اور سگنلز سے آواز پیدا کی جاتی ہے۔ چولہے میں ایندھن کی کیمیائی توانائی سے حرارت اور روشنی پیدا کی جاتی ہے۔اس کی قدرت لامحدود نہیں۔ زندہ اشیاء کانہایت محدود علم،ارادہ اور زندگی اسی کی اقسام ہیں۔ بقول رومی

ہر لحظہ بہ شکلی بتِ عیار در آمد

لیکن اسے خدا نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ اسپنوزا نے کائنات کو خدا کہا۔ رومی ہوں یا اسپنوزا ہوں، وہ لوگ توانائی، یعنی کائنات، کو ٹھیک سے نہیں سمجھے تھے اور ان کی باتیں بس تخیلات کی حد تک تھیں۔ان کی کوئی علمی قیمت نہیں ہے۔ توانائی کو ٹھیک سے سمجھنا جدید سائنس کا کارنامہ ہے۔اس کی ہر قسم کا ریاضیاتی مساواتوں کی شکل میں مکمل علمی احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس احاطے کی وجہ سے ان اقسام کو قابو میں لا کر جدید صنعت کا پہیہ چلایا جا رہا ہے۔ اب توانائی کی کل مقدار کا حساب لگایا جا چکا ہے۔ توانائی کی وحدت عددی ہے۔ وہ مرکب ہے، اسلئے اس میں تشکیک ہوتی ہے اور وہ اجزاء میں تقسیم بھی ہوتی ہے۔ مادہ و توانائی حادث ہیں، ان سے ذاتاً جڑے مکان و زمان بھی حادث ہیں۔ توانائی پاک کھانے کی شکل میں کھائی جاتی ہے تو ناپاک پاخانے کی شکل میں ٹھکانے بھی لگائی جاتی ہے۔ وہ کسی سے پیدا ہو کر کسی کو جنم بھی دیتی ہے، جیسا کہ ایک فوٹان سے دو ذرات بن سکتے ہیں۔ غرض

اس میں مخلوق کی وہ سب صفات ہیں جن سے متکلمین کے مطابق خدا پاک و منزہ ہے۔[1] خدا مخلوق سے ذاتاً الگ ہے۔ توانائی ممکن الوجود ہے، خدا واجب الوجود ہے۔ توانائی کے بتِ عیار کو پوجنا بیوقوفی ہو گی۔

علامہ مرتضیٰ مطہری کا مختصر تعارف

علامہ مرتضیٰ مطہری (متوفی 1979ء) ایران کے ایک مشہور عالم ہو گزرے ہیں۔ ان کی کتابوں کے تراجم پاکستان میں کئی مرتبہ شائع ہوئے اور اب بھی چھپتے ہیں۔ ان کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ وہ وسیع المطالعہ اور محنتی شخص تھے، اگرچہ بہت سی باتوں کو ٹھیک سے سمجھنے میں ناکام بھی رہے۔ وہ 1919ء میں ایرانی صوبے خراسان کے ایک قصبے فریمان میں پیدا ہوئے۔ وہ سکول نہ جا سکے۔ انہوں نے دینی تعلیم کیلئے قم کا رخ کیا۔ ادھر تہران یونیورسٹی میں 1935ء میں اسلامیات کا شعبہ قائم ہو چکا تھا، جسے آج کل دانشکدۂ الہیات کہا جاتا ہے۔ قم میں دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ساٹھ کی دہائی میں وہ تہران یونیورسٹی میں اسلامیات کے استاد بھرتی ہوئے۔ وہ تہران کے جدید طرز کے امام بارگاہ حسینیہ ارشاد کے سرگرم رکن رہے اور وہاں علمی مباحثوں میں شریک رہے۔ وہ گفتگو پر یقین رکھنے والے اور ایک معتدل شخص تھے۔ 1979ء میں ایران میں انقلاب آنے کے کچھ ماہ بعد ہی آیت اللہ

---

[1] دعائے صباح میں آیا ہے: یا من دلَّ علی ذاته بذاته، وتنزه عن مجانسة مخلوقاته وجل عن ملائمة كيفياته.

ترجمہ: ''اے وہ جس نے اپنی ذات پر اپنی ذات کو دلیل بنایا، جو اپنی مخلوقات کا ہم جنس ہونے سے پاک اور اسکی کیفیتوں کی آمیزش سے بلند ہے۔''

خمینی کی ایک مخالف تنظیم فرقان کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ایران میں پچھلے سو سال سے مختلف انواع واقسام کی انتہا پسندی پھیلی ہوئی ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ علامہ مرتضیٰ مطہری وحدت الوجود کے تصور سے برآمد شدہ عرفان کے قائل ہیں، جو کہ ملا صدرا کا مکتب فکر بھی ہے۔ پاکستان کے معروف شیعہ عالم علامہ محمد حسین نجفی ڈھکو نے اپنی کتاب اقامۃ البرہان میں ان کے ایک رسالے سے عبارات پیش کر کے ان کی فکر کو باطل قرار دیا ہے۔

علامہ مرتضیٰ مطہری اور ان کے استاد علامہ طباطبائی نے اصولِ فلسفہ نامی کتاب میں نیوٹن کے قوانینِ حرکت اور توانائی کے مفہوم پر بھی بحث کی ہے۔ دونوں علامہ صاحبان کی بنیادی الجھن ان کے اذہان پر لگی قدیم یونانیوں کے خیالات کی گرہیں ہیں۔ چنانچہ حرکت کے بارے میں ان استاد و شاگرد کا سارا زور اس بات پر ہے کہ جدید طبیعیات اور قدیم طبیعیات کو تاویلوں کے ذریعے متحد کریں، تاکہ ان کے پرانے نو فلاطونی فلسفے کا ریت سے بنا محل گر نہ جائے۔ وہ متروکہ یونانی طبیعیات کے تصورِ حرکت کو فلسفی حرکت کی اصطلاح میں لپیٹ کر قاری کو مغالطہ دیتے ہیں۔ جبکہ جدید فلسفہ تو جدید سائنس پر قائم ہے اور وہ یونانی طبیعیات کو قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح ملا صدرا وغیرہ نے حرکت کی بحث میں انہی اجسام کی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کی صحیح تفہیم جدید سائنس میں ممکن ہوئی۔ ملا صدرا حرکت میں اس تفکیک کا قائل نہیں۔ ان علامہ صاحبان سے پہلے کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ فلسفی حرکت اور طبیعی حرکت الگ الگ ہیں۔ بہر حال علامہ صاحبان قاری کو یہ باور کرانے پر بہت وقت صرف کرتے ہیں کہ نیوٹن نے جو کہا وہ کسی نہ کسی طرح پرانے

فلسفے کے نظریات کا ہی ایک اور بیان ہے۔ البتہ توانائی کے مفہوم پر آ کر وہ بری طرح پھنس جاتے ہیں۔

توانائی کے بارے علامہ صاحبان کی الجھنیں

نہایۃ الحکمہ میں علامہ طباطبائی کہتے ہیں:

"اگر یہ بات درست ہو کہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مادہ توانائی میں تبدیل ہو سکتا ہے اور مادہ توانائی کے ذرات کے اکٹھا ہونے سے تشکیل پاتا ہے، ضروری ہو گا کہ فلسفی بحثوں میں توانائی کو سلسلۂ جواہر میں ایک عالی نوع قرار دے کر جسم سے پہلے رکھا جائے۔[1] "

یہ بات درست نہیں ہے۔ جوہر کی تعریف اور مصداق کے تعین میں تھوڑا غور کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ یہ حضرات جسے جوہر سمجھتے تھے وہ اشیاء کی کیمیائی ترکیب ہوتی تھی اور وہ ترکیب توانائی سے پہلے نہیں بلکہ بنیادی ذرات، یعنی چھوٹے اجسام، سے بننے والے ایٹموں کے بعد آنی چاہئے۔ یعنی:

توانائی --> ذرات (چھوٹے اجسام) --> ایٹمز --> مالیکیولز (کیمیائی مرکبات)- -> بڑے اجسام

بہتر روش یہی ہے کہ جوہر کا لفظ استعمال نہ کیا جائے، جوہر ایک غیر ضروری مفروضہ تھا۔ تاہم اگر یہ لفظ استعمال کرنا پڑے تو اس کے معنی کو مشخص کیا جائے اور یہ یاد رہے کہ اس کی بنیاد میں کیا ہے؟

---

[1] علامہ محمد حسین طباطبائی، "نہایۃ الحکمہ"، صفحہ 99، مؤسسہ النشر الاسلامی، قم، 1416 ہجری۔

توانائی کے بارے ان حضرات کی اصل الجھن پرانے فلسفے کی یہ عبارت ہے کہ ''ان الهیولٰی لا تتجرد عن الصورة''، یعنی جسم سے اس کی صورت الگ نہیں ہو سکتی۔ اب توانائی جب جسمانی ذرات سے روشنی میں بدلے گی تو صورتِ جسمیہ کا کیا ہو گا؟ اگرچہ یہ بات بارہویں جماعت تک سائنس پڑھنے والے بچے کیلئے تو کوئی الجھن پیدا نہیں کرتی کیوں کہ وہ صاف ذہن سے سائنس پڑھتا ہے اور اس پر قدیم فلسفے کے مغالطات کی بارش نہیں کی جاتی، تاہم جن لوگوں نے دینی مدارس والا فلسفہ پڑھا ہوتا ہے ان کیلئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے۔ اسکا حل یہی ہے کہ پرانے فلسفے کی اس عبارت کا غلط ہونا مان لیا جائے۔

توانائی کی سمجھ نہ آئے تو یہی سوچ لیں کہ برف کے بخارات بننے تک پانی کئی صورتیں بدلتا ہے۔ اس کی کیمیائی ترکیب وہی رہتی ہے اور صورتِ جسمیہ بدلتی رہتی ہے۔ بخارات بن کر تو صورتِ جسمیہ بھی نہیں رہتی۔ اسی طرح بادل کی صورتِ جسمیہ اور ہوتی ہے تو دھند کی اور ہوتی ہے۔

توانائی کے بارے میں ان لوگوں کی الجھنوں کی ایک اور وجہ معادِ جسمانی کو یونانی اقوال سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔ اس پر مفصل بحث علامہ مرتضیٰ مطہری کی کتاب معاد میں آئی ہے۔ یہ حضرات ایک طرف اعادۂ معدوم کے محال ہونے کے قول سے چپکے رہنا چاہتے ہیں، دوسری طرف معادِ جسمانی کو تسلیم کرنا بھی ان کی مجبوری ہے۔ وحدتِ وجود کے عقیدے کے تحت عالم وجود کو ازلی و ابدی مانتے ہیں۔ چنانچہ مختلف عوالم فرض کر کے ان کے مختلف اجسام فرض کرتے ہیں۔ جبکہ مادے کی جدید تعریف کے مطابق تو یہ اجسام بھی مادی ہی ہیں، جو چیز جگہ گھیرے گی، مادی ہو گی۔ اس ساری الجھن کا آسان حل متکلمین کی طرح اعادۂ معدوم کو ممکن اور کائنات کو حادث مان لینا ہے۔ ملا صدرا (متوفی 1640ء) کو

تو جدید سائنس سے واسطہ نہیں پڑا تھا، لیکن اس دور میں کوئی ان کے اقوال سے چپکا رہے تو یہ علمی روش نہیں ہے۔

بہر حال علامہ مرتضیٰ مطہری نے جہاں خود جدید سائنس کے بارے کچھ مطالعات کئے وہیں تہران یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جناب رضا روزبہ سے توانائی کی ماہیت کو سمجھنے پر بہت مباحثہ کیا مگر یہ معما حل نہ کر سکے۔ اس کا طریقہ باقاعدہ کلاسوں میں شریک ہونا تھا لیکن بڑھاپے میں یہ ممکن نہ رہا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ یہ کام آسانی سے ہو جائے۔ کہتے ہیں:

''میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے توانائی کی ماہیت سمجھا دے۔۔۔ ایسی چیز جو مادہ نہ ہو اور مادے کی صفات و حالتیں بھی نہ رکھتی ہو، کیسے ممکن ہے وہ خارج میں کسی خاص جگہ پر ہو اور اس میں تبدیلی بھی آتی ہو؟ کیا ایٹموں میں کبھی انعدام اور حدوث و تغیر نہیں آیا؟۔۔۔[1] ''

یہاں سے ملا صدرا اور ان کے پیروکاروں کا روشنی کی ماہیت کو نہ سمجھنا عیاں ہوتا ہے کیونکہ روشنی توانائی کی ایک قسم ہے۔ اسی طرح ایٹموں کے بارے علامہ مرتضیٰ مطہری کی معلومات کی کمی بھی ظاہر ہے۔

علامہ طباطبائی اور علامہ مرتضیٰ کا شمار ملا صدرا کے فلسفے کے جدید شارحین میں ہوتا ہے۔ اگرچہ ان حضرات کو ملا صدرا کے فلسفے کا ماہر نہیں کہنا چاہئے کیونکہ یہ اس کی خامیوں سے آگاہ نہ تھے۔ البتہ ان کی کتابوں کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بعض اہلِ منبر کس

---

[1] علامہ مرتضیٰ مطہری، ''توحید''، صفحہ 172، مجموعۂ آثار استاد مطہری، جلد 4، انتشارات صدرا، تہران، 1374 شمسی۔

منہ سے آئن سٹائن وغیرہ کے سائنسی نظریات کو ملا صدرا سے منسوب کرتے رہتے ہیں؟ شاید انہوں نے خود نہ ملا صدرا کو پڑھا ہوتا ہے اور نہ ہی جدید سائنس کی کوئی سمجھ رکھتے ہیں۔ بس یہ بھی ایک نئی قسم کے ذاکرین ہیں جن کا کام لوگوں کو ملا صدرا کے فضائل سنا کر خوش کرنا ہے۔

عقل کا درست معنی کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ لوگ یونانی اقوال کو عین عقل مانتے ہیں، ان سے انحراف کو عقل کا انکار سمجھتے ہیں۔ ان کیلئے چند منطقی جملے ہی عقل ہیں۔ جبکہ عقل مخصوص اقوال سے چپکے رہنا نہیں بلکہ دماغی توازن کا نام ہے۔ دماغ حسیات کو مراحل سے گزار کر علم پیدا کرتا ہے مگر حسیات کی طرح عقل کی بھی حدود ہیں۔ جو منطقی اصول ماضی میں معقولات کہے جاتے تھے وہ بس الفاظ سے بنے جملے ہی تھے جن سے بہتر جملے اب بنائے جا چکے ہیں۔ جن باتوں کو ماضی میں بدیہیات کہا جاتا تھا ان کی جگہ سائنس نے زیادہ بہتر بدیہیات دے دی ہیں۔ جدید مغربی فلسفے کا موضوع عقلِ انسانی کو سمجھنا ہی ہے، اور یہی فلسفے کا کام ہونا چاہیئے۔ اس طرح یونانی فلسفے اور یونانی طبیعیات کے دفاع پر وقت اور وسائل ضائع کرنے کے بجائے حقیقی مسائل کو حل کرنے کی فرصت ملے گی۔ اگر مسلمانوں نے اپنے حقیقی مسائل پر توجہ نہ کی تو کوئی اور ان مسائل کو حل نہیں کرے گا۔

6. مُلا صدرا کا تصورِ علم

مُلا صدرا 1572ء میں شیراز کے ایک وڈیرے کے ہاں پیدا ہوئے۔ مالی طور پر تگڑے خاندان سے تعلق کی وجہ سے انہیں مختلف کتابیں جمع کرنے اور عربی، فقہ، قدیم فلسفہ اور تصوف وغیرہ سیکھنے میں آسانی ہوئی۔ جوانی میں وہ مزید تعلیم کے لیے اس دور کے دار الحکومت اصفہان چلے گئے جہاں سے 1601ء میں واپس شیراز آ گئے اور پھر شہر کے علما سے وحدت الوجود جیسے مسائل پر لڑ کر قم چلے گئے۔ وہاں کہک نامی ایک گاؤں میں دس سال سکونت اختیار کی اور پھر واپس شیراز آ گئے۔ دولت کی ریل پیل کی وجہ سے سات مرتبہ حج پر گئے۔ انہیں کاغذ کی کمی کا سامنا کبھی نہ ہوا، جو اس زمانے میں نایاب ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ان کی مظلومیت کے قصّے داستان سرائی سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ انہوں نے چالیس کے قریب کتابیں لکھیں جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کا انداز ایک محقق والا نہیں بلکہ ایک ناول نگار والا ہے، جو اپنے خیالات کو لفظوں میں پرو رہا ہے اور کوئی شواہد مہیا کرنے کا پابند نہیں ہے۔ مُلا صدرا کی تحریروں میں فرسودہ یونانی خیالات کے وسیع مطالعے کا اظہار ہوتا ہے، البتہ آپ کسی علم میں اصلاح یا پیشرفت کا سبب نہ بنے۔ ایسا بھی لگتا ہے کہ ملا صدرا اکثر باتیں اپنے حافظے کے زور پر لکھتے تھے اور جو ذہن میں آ جاتا اس کو پرکھنے کے بجائے اسے الہام قرار دیتے تھے، اسی وجہ سے اندھا دھند لکھتے جاتے تھے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ دوسروں کے خیالات جو آپ نے ماضی میں پڑھے تھے وہ گڈ مڈ ہو کر یاداشت سے ظاہر ہوتے ہوں تو آپ ان کو اپنا کشف سمجھتے ہوں، اور اسی لیے ان کا نام نہ لیتے ہوں۔ ملا صدرا

اپنے زمانے میں مغرب میں ہونے والی پیشرفت سے بالکل ناواقف نظر آتے ہیں، جو ان کے الہام اور کشف کے دعوؤں کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔ مثلاً کوپر نیکس، جو کہ 1543ء میں وفات پا چکے تھے، ان کے بعد پیدا ہونے والے ملا صدرا زمین کو ساکن مانتے ہیں۔[1] اپنے ہم عصروں، گلیلیو، کیپلر، ڈیکارٹ وغیرہ کے بارے میں بھی ملا صدرا بالکل اندھیرے میں ہیں۔ ملا صدرا کا مشہور ناول، اسفارِ اربعہ، بیروت سے دار احیاء التراث العربی نے نو جلدوں اور ساڑھے تین ہزار صفحات میں شائع کیا ہے۔ بقول غالب:

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی 1956ء) نے اس کے ابتدائی حصّے کا اردو میں جو ترجمہ کیا تھا وہ 2018ء میں لاہور سے حق پبلیکیشنز نے ''فلسفۂ ملا صدرا'' کے عنوان سے دوبارہ شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ بیروت کی چھاپ کی تین جلدوں کا احاطہ کرتا ہے اور نو سو بیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس ناول کا ہر باب فرضی خرافات کا پلندہ ہے۔ اختصار کے تقاضے کے پیش نظر اردو ترجمہ سے چند ایک اقتباسات ہی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ملا صدرا فرماتے ہیں:

''دوام ریاضت و مجاہدے سے بالآخر میری روح ایک نورانی کیفیت کے ساتھ بھبھک اٹھی، اور دل ایک قوی روشنی سے چمک اٹھا جس کی بدولت ملکوت کے انوار کی بارش مجھ پر

---

[1] ملا صدرا، ''المبدأ أو المعاد''، صفحہ 278، تصحیح: سید جلال الدین آشتیانی، طبع سوم، 2001ء۔

ہونے لگی۔۔۔ حق تعالیٰ نے مجھے الہام فرمایا کہ جس جرعے سے میں خود فیضیاب ہوا ہوں اس کی تقسیم ان پیاسوں میں بھی کروں جو علم کے طالب ہیں۔"[1]

"ظاہر پرستوں کے ایک جھوٹے فرقے کے سوا حکما متفق اللسان ہیں کہ تمام اشیا کے لیے وجود ظاہر اور اس کے ظہور کے سوا جو ہر شخص کو معلوم ہے، ایک اور وجود، ایک اور ظہور بھی ہے جس کی تعبیر وجود ذہنی سے کی جاتی ہے جو اس شے کا مظہر ہوتا ہے، بلکہ دراصل اس شے کے ظہور کا مقام عقل کی ادراکی قوتیں اور حس کے شعوری تاثرات ہوتے ہیں۔"[2]

"حق تعالیٰ ایسے موجودات کا بھی خالق ہے جو کسی چیز یعنی مادہ کے بغیر پیدا ہوتے ہیں، جن کو موجودات مبدعہ کہتے ہیں۔ اور ایسی چیزوں کا بھی پیدا کرنے والا ہے جو دوسری چیزوں سے پیدا ہوئی ہیں جن کو موجودات کائنہ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلے میں انسانی نفس کو بھی پیدا کیا جو اپنی ذات، اپنی صفات اور اپنے افعال میں حق تعالیٰ کی مثال ہے۔ کیوں کہ ذات حق اگر منزہ و مقدس ہے تو مثل سے نہ کہ مثال سے، اور جب اس کے لیے مثال ہو سکتی ہے تو اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق اسی لیے ہوئی ہے کہ وہ ذات

---

[1] سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 11، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

[2] سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 179، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

میں، صفات میں اور افعال میں خدا کی مثال بن سکے تا کہ نفس انسانی کی معرفت، معرفت حق کے لیے زینہ بن سکے۔۔۔ نفس سے جو چیزیں اس طرز پر صادر ہوتی ہیں اور جن کا ظہور اس شکل میں ہوتا ہے اسی کا نام وجود ظلی اور ذہنی ہے، اور ظہور کی وہ نوعیت جس پر واقعی آثار مرتب ہوتے ہیں اسی کا نام وجود خارجی اور عینی ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کی تائید شیخ جلیل محی الدین ابن عربی اندلسی کے اس کلام سے ہوتی ہے جسے انہوں نے اپنی کتاب فصوص الحکم میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے: 'وہم کے ذریعے انسان اپنی خیالی قوت کے دائرے میں ان چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن کا وجود بجز خیال کے اور کہیں نہیں ہوتا، اور یہ بات تو ہر عامی آدمی کو حاصل ہے، لیکن عارف ہمت کے ذریعے سے ان چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن کا وجود خارج میں ہوتا ہے'۔''[1]

''ہم جب ستاروں کے مقامات اور افلاک وغیرہ کی تعداد پر ایمان محض ایسے حکما، جیسے ابرخس وغیرہ، کی ان رصدی اطلاعات و تجربات کی بنیاد پر لاتے ہیں جن میں عموماً علم کا ذریعہ حس ہوتا ہے، جہاں غلطی اور بھول چوک کا احتمال بہت زیادہ ہے، تو ظاہر ہے جن بزرگ حکمانے عقلی رصدگاہوں کے ذریعے سے علوم حاصل کئے ہیں اور انہیں اپنے ایسے

---

[1] سید مناظر احسن گیلانی، ''فلسفۂ ملا صدرا''، صفحات 181 و 182، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

مسلسل تجربات کے نتائج قرار دیتے ہیں جن میں خطا کی گنجائش نہیں، ان کی باتیں زیادہ قابل یقین ہیں۔"[1]

" وجود ذہنی کے متعلق چوتھی مشکل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اگر اشیا کے لیے وجود ذہنی مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ آدمی کا ذہن گرمی اور حرارت کے تصور کے وقت گرم ہو جائے اور برودت و سردی کو تصور کرتے ہوئے سرد ہو جائے۔ اسی پر دوسرے مشتقات کو قیاس کر لو۔ الغرض یہ لازم آتا ہے کہ نفس اجسام کے صفات اور متضاد و متناقص امور کے ساتھ موصوف ہو جائے حالانکہ یہ ایک بدیہی البطلان امر ہے۔۔۔ پہلا جواب تو یہی ہے کہ اس کا شمار عرشیات میں ہونا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ نفس جس وقت اشیا کا تصور کرتا ہے اس وقت ان چیزوں کی صورتیں نفس کی حکومت اور ملکوت کی سرحد میں تو رہتی ہیں لیکن اس میں ان کا حلول نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح دیکھنے کے دوران یہ ہوتا ہے کہ نفس ناطقہ، جو ایک نورانی جوہر ہے، اس سے قوت باصرہ پر ایک نور چمکتا ہے۔ اسی نور کے ذریعے سے آنکھ کو اس چیز کا جو جلیدیہ کے سامنے ہے، ایک حضوری اشراقی علم حاصل ہو جاتا ہے، جس میں آنکھ کے اندر کوئی چیز نہ چھپتی ہے اور نہ منطبع ہوتی ہے جیسا کہ پرانے زمانے والوں کا خیال تھا۔ بہر حال کچھ اسی طرح جب قوت متخیلہ پر نفس ناطقہ سے نور کی ریزش ہوتی ہے تو اس صورت متخیلہ کا، جو اس کی ذات سے خارج ہے اور نفس کی ذات

---

1 سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 208، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

سے بالکل جدااور مبائن ہے،اس کا حضوری اور اشراقی علم نفس کو حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں نہ صورت کا حلول نفس میں ہوتا ہے اور نہ نفس اس صورت سے متصف ہوتا ہے۔ بلکہ جس طرح خارجی اشیا کا احساس قوت بینائی اور باصرہ وغیرہ سے ہوتا ہے،اسی طرح نفس باطنی صورتوں کو دیکھتا ہے اور ان کا اپنے باطنی حواس کے ذریعے مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر ان صورتوں کا نفس میں حلول نہیں ہوتا۔ خواب میں صورتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے، ان دونوں مشاہدوں میں وجدان اور ذوق کسی قسم کا فرق محسوس نہیں کرتا۔"[1](فلسفۂ ملا صدرا،)

"علم تو نام ہے شے کا شے کے سامنے حاضر ہونے کا،اور جس کے سامنے کسی شے کا حضور ہی نہیں ہے،اس شے کا اس کو علم بھی نہیں ہو سکتا۔الغرض وجود جتنا کمزور اور ضعیف ہو گا اسی نسبت سے علم بھی کم ہو گا اور وہ چیزیں بھی کم ہوں گی جو علم پر مرتب ہوتی ہیں۔"[2]

تبصرہ

آخری اقتباس میں ملا صدرا علمِ حضوری کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو ایک باطل تصور ہے۔ ملا صدرا کے خیالات سے ایسے لگتا ہے کہ گویا وہ معلومات (data) اور خیالات کو ہی علم کہہ رہے ہیں، لہٰذا قاری کو اس بارے میں احتیاط کرنی چاہیے اور جہاں وہ علم کا لفظ

---

1 سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحات 208 و 209، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

2 سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 462، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

استعمال کریں، اسے ڈیٹا یا تخیل(imagination) کے معنوں میں سمجھنا چاہیے۔ واضح ہے کہ ذہن کے بارے میں ملا صدرا جو کچھ فرمارہے ہیں وہ سب غلط ہے، اگرچہ ان کے مرید ان کی حماقتوں کو ''عقلی دلائل'' کہتے رہتے ہیں۔ صحیح اور غلط معلومات کی جانچ کے بعد حاصل ہونے والے کلی قاعدے جو درست پیشگوئی کر سکیں علم کہلاتے ہیں۔ انسان کے دماغ میں معلومات کیسے پہنچتی ہیں اور ان میں سے علم کیسے اخذ ہوتا ہے، ایک ایسا موضوع ہے جس پر نیورو سائنس، سائیکالوجی، زبان شناسی اور کوانٹم انفارمیشن سائنس کے شعبوں میں دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں تحقیق ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان علوم میں ہزاروں کتابیں اور لاکھوں مقالے سامنے آچکے ہیں، جن میں شواہد کی روشنی میں نظریات پیش کیے جاتے ہیں اور جنہیں کوئی بھی پرکھ سکتا ہے اور ان سے نئی معلومات نکال سکتا ہے۔ اوپر دیئے گئے چوتھے اقتباس میں ملا صدرا قیاس مع الفارق (false.analogy) اور توسل بہ شخصیت (argument.from.authority) کے مغالطے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ فلکیات کا قیاس پیروں فقیروں کے عرفانی دعووں پر کر رہے ہیں، جبکہ فلکیات میں جن مشاہدات کا بیان آتا ہے وہ سب کے لیے قابل تکرار اور پیش گوئی ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے اب فلکیات کا علم ابرخس کے نظریات سے کہیں عمیق تر اور صحیح تر شکل میں آچکا ہے۔

عرفانی دعوؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، اگرچہ مریض کو پکا یقین ہوتا ہے کہ اس نے بارہا کچھ دیکھا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ نفسیاتی امراض کے ہسپتال میں موجود کسی دماغی مریض کو

اپنے تخیلات پر یقین ہے، ان کو درست نہیں سمجھا جا سکتا کیوں کہ نہ تو وہ دوسروں کے لیے قابل تکرار ہیں نہ خارجی دنیا کے بارے میں کوئی پیشگوئی کر سکتے ہیں۔ وہاں کسی کو یہ یقین ہے کہ اسے ملک کا وزیر اعظم بنا دیا گیا ہے تو کوئی مرد ہو کر خود کو حاملہ سمجھے بیٹھا ہے تو کسی کو یقین ہے کہ ایک دیو اسکا گلا دبانے آتا ہے تو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ دائیں ٹانگ اسکی ٹانگ نہیں ہے۔ ایسے یقین کی کیا علمی قدر و قیمت ہے؟ یہی معاملہ پہلے اقتباس میں ملا صدرا کے الہام کے دعوے کا ہے۔ رہی دوسرے اور پانچویں اقتباس میں وجود ذہنی کی بات تو اشیا ذہن میں داخل نہیں ہوتیں نہ ذہن میں ان کی تصویریں بنتی ہیں، بلکہ ان کے بارے میں برقی سگنلز کی مدد سے معلومات ذہن تک پہنچتی ہیں اور وہاں خلیوں میں ذرات کی ترتیب کی شکل میں محفوظ ہوتی ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کمپیوٹر کی میموری میں کسی تصویر کا ڈیٹا محفوظ ہوتا ہے یا جیسے کسی کوئلے کے ٹکڑے کے جلنے اور اس کے رنگ اور درجہ حرارت اور حجم کے بارے میں معلومات کاغذ پر لکھی جائیں۔ اس سے کاغذ کیوں جلے گا؟ جلنا اصل میں مالیکولز کی اتنی تیز تھرتھراہٹ کا نام ہے کہ تعادل بگڑنے سے ٹوٹنے اور روشنی خارج کرنے لگیں۔ یہ بھی جاننا چاہیے کہ دیکھنے کے عمل میں انسان کے اندر سے کوئی روشنی آنکھ پر نہیں جاتی بلکہ باہر کی چیزوں سے ٹکرا کر آنے والی روشنی آنکھ پر پڑتی ہے تو اس سے برقی سگنل پیدا ہوتا ہے جو دماغ تک معلومات پہنچاتا ہے۔

جہاں تک تیسرے اقتباس کا تعلق ہے تو عارف کا زور لگا کر خارج میں کسی نئی چیز کو پیدا کرنا قانون بقائے توانائی کی خلاف ورزی ہے۔ اگر کوئی عارف ایسا کر کے دکھادے تو اسے نوبل

انعام ملے گا۔ البتہ چونکہ وجود اصالت نہیں رکھتا اور ماہیت اصالت رکھتی ہے، لہٰذا انسان چیزوں کی ماہیت کو تبدیل کر کے نئی چیزیں بنا لیتا ہے جیسے سمارٹ فون، گاڑی، کمپیوٹر، ادویات، وغیرہ۔ یہ کام بھی عارفوں نے نہیں بلکہ انجینئرز نے سائنس کی روشنی میں کئے ہیں۔ جہاں تک خیالی پلاؤ تناول فرمانے کا تعلق ہے تو اس میں یہ جاننا چاہئیے کہ انسان کے دماغ کا دیاں حصہ تخیل کا کردار ادا کرتا ہے اور مختلف معلومات کو ملاتا اور نئی نئی شکلیں دیتا رہتا ہے، جیسا کہ خواب میں ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ خیالات بائیں حصے میں منتقل ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے یہ غیبی دنیا سے آ گئے ہیں۔ بایاں حصہ شعور کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ ان خیالات پر تجزیہ و تحلیل کرتا اور ان کو خارجی شواہد کی روشنی میں تصدیق یا تردید کے عمل سے گزارتا ہے۔ شعور ہی کی مدد سے انسان خارجی دنیا میں کردار ادا کرتا ہے۔[1] تخیل کو کچلنا

---

[1] ڈاکٹر خالد سہیل، ''روحانیات: نفسیات اور سائنسی تحقیقات (دوسری قسط)''، ہم سب، 30 ستمبر 2022ء۔

''ڈاکٹر بکمین کا کہنا ہے کہ انسان کے دماغ کے دو حصے ہیں۔ بائیں دماغ کا تعلق زبان اور گفتگو سے ہے جبکہ دائیں دماغ کا تعلق اپنی ذات اور کائنات کی پہچان اور شعور سے ہے۔ 1940 سے انسانی دماغ کی لہروں کے ای ای جی کے ٹیسٹ نے ہمیں اس معمہ کو حل کرنے میں مدد کی۔ بکمین نے ہمیں بتایا کہ دائیں دماغ کی حساسیت کی وجہ سے ہم انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے دائیں دماغ کے ٹمپورل لوب حد سے زیادہ حساس ہیں۔ جب یہ حصے خود بخود فعال ہو جاتے ہیں تو انسانوں پر مرگی کے دورے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

ڈاکٹر ہولنگز جیکسن نے مرگی کے مریضوں پر تحقیق کر کے ہمیں بتایا کہ دائیں دماغ کی ٹمپورل لوب کی مرگی کا تجربہ روحانی تجربے سے مشابہت رکھتا ہے۔ایسے مریض کی ایک مثال روس کے مشہور لکھاری فیودور دوستووسکی تھے جنہیں مرگی کے دورے پڑتے تھے۔وہ اپنے ٹمپورل لوب کی مرگی کے دورے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'میرے شعور میں اچانک حیرت انگیز تبدیلی آئی۔مجھے یوں لگا جیسے میری روح میں ایک در کھل گیا ہو اور اس میں روشنی داخل ہو رہی ہو'۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ عین ممکن ہے دوستووسکی کی طرح بعض سنت سادھو اور صوفی بھی ٹمپورل لوب کی مرگی کے مریض ہوں۔ڈاکٹر ولڈر پینفیلڈ نے بھی انسانی دماغ پر کافی تحقیق کی ہے۔ان کی تحقیق نے ہمیں بتایا ہے کہ جب انسانی دماغ کے بائیں حصے کو لیبارٹری میں فعال کیا جاتا ہے تو جسم کے مختلف حصے حرکت میں آجاتے ہیں لیکن جب دائیں دماغ کے ٹمپورل لوب کو STIMULATE کیا جاتا ہے تو جسم کے کسی حصے میں کوئی حرکت نہیں ہوتی بلکہ انسانی شعور میں تبدیلی آتی ہے اور اسے کسی اور ہستی کی قربت اور ہونے کا احساس ہوتا ہے۔بعض لوگوں کو یوں لگتا ہے جیسے ان کا کسی دیوتا یا فرشتے سے رشتہ جڑ گیا ہو۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جس کا دائیں دماغ کا ٹمپورل لوب حساس ہے لیکن حد سے زیادہ نہیں۔ایسے لوگ فنکار بن جاتے ہیں۔چاہے وہ شاعر ہوں ادیب ہوں' دانشور ہوں یا ایکٹر۔وہ ایک خیالی دنیا میں چلے جاتے ہیں اور فن پارے تخلیق کرتے ہیں۔تیسرا گروہ عام لوگوں کا ہے جن کے دائیں دماغ کے ٹمپورل لوب حساس نہیں ہوتے۔انہیں نہ مرگی کے دورے پڑتے ہیں اور نہ ہی وہ شاعر' ادیب' دانشور یا ایکٹر بنتے ہیں۔ایک اور سائنسدان ایم اے پرسنگر نے اپنی تحقیق سے ہمیں یہ بتایا کہ اگر ہم عام انسانوں کے دائیں ٹمپورل لوب کو لیبارٹری میں فعال کریں تو انہیں بھی روحانی تجربات ہوتے ہیں۔وہ پرسکون محسوس کرتے ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ وہ کسی ماورائی طاقت کے ساتھ جڑ گئے ہوں۔''

ذہنی صحت کے لیے اچھا نہیں لیکن اگر تخیل پر شعور حاکم نہ ہو تو تخیل شعور کو برباد کر دیتا ہے اور ایسی ایسی چیزیں باور کروا دیتا ہے کہ انسان حقیقت سے کٹ جاتا ہے۔ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگے۔علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

"عالم برزخ سے نکلنے کے ابتدائی مرحلے میں جب نفس کی تجلیات شروع ہوتی ہیں تو سالک اپنے آپ کو مادی صورت میں مشاہدہ کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے برابر کھڑا ہے۔یہ مرحلہ تجرد نفسی کی ابتداء ہے۔[1] "

عرفا کا اصل مسئلہ تخیل کو اپنا پیشوا بنانا ہوتا ہے۔اپنے ذہن پر ریاضت کا بوجھ ڈالنے اور عقل و شعور کو معطل کرنے سے ان کا تخیل بہت قوی ہو جاتا ہے اور دور تک پرواز کرنے لگتا ہے۔اسی لیے وہ اکثر شاعر اور افسانہ گو تو اچھے ہوتے ہیں لیکن علم اور حقیقت کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ان کے مکاشفے اور خواب میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا ہے، یوں وہ زندگی ایک جھوٹ اور سراب کے تعاقب میں ضائع کر دیتے ہیں۔ نوجوانوں کو چاہئیے کہ اپنے آپ کو جدید علوم سے محروم نہ رکھیں اور صوفی ازم میں نہ پڑیں۔اگرچہ یہ کافی محنت طلب کام ہے اور اس میں خیالی پلاؤ جیسا نشہ نہیں ہے، لیکن زندگی کا مزہ حقائق کو جاننے میں ہی ہے۔

---

[1] علامہ طباطبائی، "سیر و سلوک"، صفحہ 115، جامعہ تعلیمات اسلامی، کراچی، 2002ء۔

7. مُلا صدرا کی فکر میں کچھ بنیادی خامیاں

ملا صدرا (متوفی 1640ء) کے افکار پر تنقید کے سلسلے میں یہاں ان کی فکر کے کچھ مزید نمونے پیش کرنے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ ہم ان کو بُرا بھلا کہیں۔ ان کا زمانہ چلا گیا ہے۔ ان کے فکری انحراف کو سمجھنا صرف اس لیے ضروری ہے تاکہ ہم آج کے دور میں وہ غلطیاں نہ دہرائیں اور نوجوان نسل کسی پروپیگنڈے کی زد میں آکر اس بھوسے سے سونا تلاش کرنے پر اپنی قیمتی زندگی ضائع نہ کرے۔ ملا صدرا کے معروف ناول، اسفارِ اربعہ، کے پہلے حصے کا اردو ترجمہ 2018ء میں حق پبلیکیشنز نے لاہور سے ''فلسفۂ ملا صدرا'' کے عنوان سے شائع کیا ہے اور وہ بیروت کی نو جلدی چھاپ کی پہلی تین جلدوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہاں اس کا حوالہ صفحہ نمبر کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے۔ باقی حوالے علیحدہ درج کئے جائیں گے۔

1. یونانی سلفیت

ملا صدرا نے کبھی اپنے فلسفے کو اسلامی فلسفہ نہیں کہا۔ واضح ہے کہ فلسفہ انسانی فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور کسی مذہب کو کسی فلسفے کا پابند نہیں کیا جا سکتا، نہ کسی مذہب کو ہتھیار بنا کر کسی فلسفے سے اختلاف رکھنے والوں پر تکفیر کی تلوار چلائی جا سکتی ہے۔ البتہ وہ مصر کے شہر سکندریہ میں فلوطین Plotinus (متوفی 270ء) کے بعد سامنے آنے والے نو فلاطونی مکتب فکر کے ترجمان سمجھے جا سکتے ہیں۔ ملا صدرا پر یونانیوں کا گہرا اثر تھا، وہ جگہ جگہ ان کو اولیائے الٰہی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی غلطیاں پکڑنے جیسی توہین کیسے کر سکتے تھے؟ وہ اگر کسی

بات سے متفق نہیں ہوتے تو وہاں بھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کسی نے بعد میں غلطی سے منسوب کی ہوگی۔[1] ملا صدرا کی کتاب مفاتیح الغیب میں یونانی فلسفیوں کو بڑی مبالغہ آمیزی کے ساتھ سلامِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔[2] یوں وہ ایک طرح سے یونانی اخباری ہیں، یعنی یونانی اخبار کو مقدس الہام سمجھ کر اپنی عقل کو ان سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ اسی دماغی تالے کی وجہ سے صدرائی فرقے میں مصری سلفیوں کی سی شدت پسندی اور اخوان المسلمون سے نظریاتی قربت پائی جاتی ہے۔[3]

2. قاعدۃ الواحد

ملا صدرا فرماتے ہیں: ''واحد سے بجز واحد کے اور کوئی چیز صادر نہیں ہو سکتی، یعنی ایک سے ایک ہی پیدا ہو سکتا ہے''۔[4] یہ بظاہر سادہ سا مغالطہ ملا صدرا کے لیے بہت اہم ہے اور اس کا ذکر وہ اپنے ناول میں بار بار کرتے ہیں، اور اس کے بعد لفظی طومار باندھتے ہیں۔ یہ مغالطہ بھی یونانیوں سے لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات کوئی واقعیت نہیں رکھتی۔ بعض

---

1 سید مناظر احسن گیلانی، ''فلسفۂ ملا صدرا''، صفحات 142، 477، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

2 ملا صدرا، مفاتیح الغیب، صفحات 379و380، انجمن اسلامی حکمت و فلسفہ ایران، تہران، 1984ء۔

3 مصباح یزدی، ''نظریۂ سیاسی اسلام''، جلد دوم، صفحہ 237، انتشارات مؤسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی، قم، 2022ء۔

4 سید مناظر احسن گیلانی، ''فلسفۂ ملا صدرا''، صفحہ 527، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

اوقات ایک ہی خلیے سے (monozygotic)جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں جو شکل و صورت میں ہو بہو ایک سے ہوتے ہیں۔اب اگر اس خلیے کا جوہر ایک تھا، تو دو جوہر بن گئے، نفس ایک تھا تو دو نفوس نکلے۔اس سے بڑھ کر بارہویں جماعت کی سائنس میں روشنی کے بسیط ذرے سے دو مادی ذرات کا بننا بھی پڑھایا جاتا ہے۔ اسے (pair production)کہتے ہیں۔ملا صدرا کے بہت سے مغالطوں کو آپ بارہویں جماعت کی سائنس کی کتابوں سے بھی حل کر سکتے ہیں جو بازار میں آسانی سے دستیاب ہیں۔

یونانی روایت میں خدا کو صرف ایک معلول کی علت کہنے کے تصور کی شاید یہ بنیاد تھی کہ وہ مختلف کاموں کے لیے مختلف خداؤں کے قائل تھے۔ان کے فلسفے میں زیوس،اپولو،ایریز، الیکٹرا وغیرہ ایک ایک مظہرِ فطرت کی لگام تھامے ہوئے تھے۔البتہ جب سکندر نے مصر فتح کیا اور وہاں یونانی فلسفے کا انضمام ہندوستانی تصوف سے ہوا جو وحدت الوجود کا قائل تھا تو فلوطین کے زمانے سے قاعدۃ الواحد کی بنیاد پر عقول کے صدور کی داستان ترتیب پانے لگی۔ جدید علوم سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ عقل صرف انہی زندہ چیزوں میں ہو سکتی ہے جن میں معلومات کو اکٹھا کرنے اور ان کو استعمال کرنے کا نظام (nervous system) موجود ہو اور ایسا سورج، زحل یا نیپچون وغیرہ میں نہیں ہے۔

دوسری طرف شیعہ احادیث میں ایسی روایات پائی جاتی ہیں جو متکلمین کے لیے ایسے علت سے معلول کے تولد جیسے تصورِ تخلیق کو ماننا مشکل بناتی ہیں، لہٰذا ملا صدرا کو دینی حلقوں میں

زیادہ پذیرائی نہیں مل سکی۔ مثال کے طور پر شیخ صدوق کی کتابِ توحید میں آیا ہے کہ امام علی زین العابدینؑ نے فرمایا:

"خدا جانتا تھا کہ آخری زمانے کے لوگوں میں گہری کھوج کے شوقین گروہ ہوں گے لہٰذا اس نے سورۂ توحید اور سورۂ حدید میں وَہوَ عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ تک کی آیات نازل کیں۔ پس جو ان سے باہر نکلا وہ ہلاک ہو گا۔[1]"

سورہ توحید میں خدا سے کسی کے تولد کو باطل قرار دیا گیا ہے تو سورہ مائدہ کی آیت 73 میں تثلیث کو غلط قرار دیا گیا ہے: لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ۔

معروف شیعہ متکلم اور مرجع آیۃ اللہ العظمیٰ صافی گلپائگانی (متوفی 2022ء) فرماتے ہیں:

"فلاسفہ نے حادث و قدیم کے تعلق کو مخلوق و خالق کے بجائے معلول و علت کے تعلق کی طرح قرار دیا، جبکہ ان میں واضح فرق ہے۔ کہاں خالق و مخلوق اور کہاں علت و معلول؟ دوسری اصطلاح سے وہ مفہوم نہیں نکلتا جو پہلی اصطلاح سے سمجھ میں آتا ہے، جو دوسری کا مطلب ہے وہ پہلی کا نہیں ہے۔ دونوں راستے ایک نہیں اور نہ ہی ایک مقصد تک پہنچاتے ہیں۔ علت پہلی، دوسری،۔۔ ہو سکتی ہے لیکن خالق پہلا، دوسرا اور تیسرا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معلول بھی پہلا، دوسرا، تیسرا۔۔۔ ہو سکتا ہے لیکن مخلوق میں ایسا اول، دوم، سوم کا

---

1 شیخ صدوق، "کتاب التوحید"، باب 40، حدیث 2، صفحہ 283، دار المعرفہ، بیروت۔

سلسلہ نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض احادیث میں ''اول ما خلق اللہ نوری'' آیا ہے، لیکن اس سے مراد وہ نہیں کہ جیسے پہلے معلول کو دوسرے کی علت، اور دوسرے کو تیسرے کی علت سمجھا جائے ویسے ہی پہلی مخلوق دوسری کی خالق ہو۔ سب مخلوقات، چاہے کچھ پہلے خلق ہوئی ہوں اور کچھ بعد میں، انکا خالق ایک ہی ہے اور سب کو اسی ایک سے خلقت کی نسبت ہے۔ یہ ایسا تعلق نہیں جیسے معلولِ ثانی جو کہ علتِ ثالثہ ہو وہ معلولِ اول و علتِ ثانیہ کا معلول ہو۔[1]''

3. اعادہ معدوم کا محال ہونا

اسفار اربعہ کے اردو ترجمے فلسفۂ ملا صدرا کے صفحہ 238 پر ایک فصل قائم کی گئی ہے جس کا عنوان ہے: ''معدوم کا اعادہ ناجائز ہے''۔[2] اس پر کئی صفحات میں بحث کرتے ہیں۔ ملا صدرا کے دلائل کی بنیاد اصالتِ وجود کا مغالطہ اور وقت کے بارے میں ان کے تصوارت ہیں۔ لیکن نہ تو وجود کو اصالت حاصل ہے نہ وقت مطلق حیثیت رکھتا ہے۔ وجود اصل میں ماہیت کی ہی صفت ہوتی ہے۔ جب ہم کسی چیز کی ماہیت کا واقعیت میں تجربہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ ہے۔ جب اس کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور کسی دوسرے کل کا حصہ بن جاتے

---

[1] آیۃ اللہ العظمیٰ صافی گلپائگانی، ''لمحاتٌ فی الکتاب والحدیث والمذہب''، جلد 3، صفحہ 389، قم، 2012ء۔

[2] سید مناظر احسن گیلانی، ''فلسفۂ ملا صدرا''، صفحہ 238، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

ہیں تو وہ وجود ختم ہو جاتا ہے اور نیا وجود بن جاتا ہے۔ وجود خود سے اصالت نہیں رکھتا،[1] نہ علمِ حضوری کچھ ہوتا ہے۔ ہم پہلے چیزوں کے آثار کا تجربہ کرتے ہیں، پھر انکے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ بہت تیزی سے ہوتا ہے۔ آئن سٹائن کے نظریۂ نسبیت کے مطابق اس عمل کی تیزی کی حد روشنی کی رفتار ہے۔ چنانچہ اگر سورج معدوم ہو جائے تو اسکے عدم کے بارے میں زمین کے باسیوں کو آٹھ منٹ بعد پتا چلے گا۔ آئن سٹائن کے کام نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ زمان و مکان اعتباری ہیں۔

چیزوں کے اجزاء کے بارے میں ایک اور اصول کی طرف متوجہ رہنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایٹموں اور مالیکیولز کی کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر ہم دریا سے ایک برتن میں پانی لے کر اسے بھاپ بنا کر اڑا دیں تو وہ ذرات دریا کے ذرات نہیں رہیں گے بلکہ ہوا کی شناخت اپنا لیں گے۔ اسی طرح جب ہمارے جسم سے کچھ ذرات نکل کر نئے ذرات داخل ہوتے ہیں تو ہمارے جسم کی شناخت تبدیل نہیں ہوتی کیونکہ نئے ذرات اپنے ساتھ کوئی شناخت نہیں لاتے۔ چھوٹے اجزا کی شناخت بدلتی رہتی ہے اور اس کے دلائل کوانٹم فزکس کی کتابوں میں جسیماتِ متماثلہ (identical particles) کے ابواب میں آئے ہیں۔ یہاں سے ہیراکلیٹس (Heraclitus) کے اس خیال کا بطلان بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی دریا میں دوبارہ پاؤں نہیں ڈال سکتا۔ چنانچہ اگر کسی کا

---

[1] آیۃ اللہ جواد تہرانی، ''عارف و صوفی چہ می گویند''، صفحات 277 تا 280، نشر آفاق، تہران، 2010ء۔

گدھا مر جائے اور اس کے جسم کا سارا مواد مٹی میں مل کر درخت کا حصہ بن جائے۔ پھر کچھ سالوں کے بعد کسی طرح انہی صفات والا گدھا پیدا کر لیا جائے تو یہ بعینہٖ وہی پہلے والا گدھا ہو گا۔

البتہ ملا صدرا کے لیے یونانی فلاسفہ کے ایسے خیالات کا کوئی فیصلہ کن رد ممکن نہ ہو سکا اور ملا صدرا یونانی اسلاف کے طریقے سے ہٹنے کو تیار بھی نہیں تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ معادِ جسمانی کے منکر ہو گئے۔ سادہ الفاظ میں ملا صدرا کا یہ ماننا ہے کہ مرنے کے بعد ہم ختم ہو جائیں گے اور دوبارہ ہم خود نہیں اٹھیں گے بلکہ ہماری فوٹو کاپی (اصل سے بہتر نقل) کو جنت یا جہنم بھیجا جائے گا۔[1] لہٰذا اس مسئلے پر ان کا مذہب کے علماء سے اختلاف ہو گیا جو اسے قرآن و حدیث میں جسمِ عنصری کے اعادے کے شواہد کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ معدوم کے اعادے کو اہلِ مکہ کے فلسفی جیسے عمرو بن ہشام، المعروف ابو جہل، وغیرہ بھی نہیں مانتے تھے۔[2] ان کے بارے بھی اغلب گمان یہی ہے کہ وہ فلوطین کے پیرو تھے کیونکہ یہی فلسفہ اس وقت کے مصر اور عرب کا غالب فلسفہ تھا۔ بہر حال ملا صدرا ان علمائے دین کے بارے میں یوں گل فشانی فرماتے ہیں:

---

1 سید مناظر احسن گیلانی، ''فلسفۂ ملا صدرا''، صفحہ 245، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

2 سورہ بنی اسرائیل، آیت 49

(اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے پھر نئے بن کر اٹھیں گے؟)

"یہ لوگ فی الحقیقت صرف بدعت و گمراہی کے علمبردار ہیں، جہال اور کمینوں کے پیشوا ہیں۔ ان کی ساری شرارتیں محض اربابِ دین و تقویٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور علماء کو ہی نقصان اور ضرر پہنچاتے ہیں۔ ان کو سب سے زیادہ عداوت حکماء کے اس گروہ سے ہے جو ایمان والے ہیں اور فلاسفہ کی جماعت میں جور بانی ہیں۔ یہ جھگڑے والوں کا وہ طائفہ ہے جو معقولات کے اندر گھسنا چاہتے ہیں حالانکہ ابھی تک انہوں نے محسوسات ہی کا علم حاصل نہیں کیا۔ یہ براہین و قیاسات کو استعمال کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ابھی ریاضیات کو بھی انہوں نے درست نہیں کیا ہے۔ یہ الٰہیات پر گفتگو کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں حالانکہ ابھی یہ طبیعات کے مسائل سے بھی ناواقف ہیں۔[1]"

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب جبکہ ملا صدرا کی طبیعات، یعنی مادہ، حرکت، فلک، زمان و مکان وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات باطل ثابت ہو چکے ہیں تو ان کی میٹافزکس کیسے قابلِ اعتبار ہے؟ جو ترازو ملا صدرا اُس زمانے کے علماء کے لیے استعمال کر رہے تھے، اس میں ان کی اپنی فکر کو تولنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ آیۃاللہ جواد تہرانی (متوفی 1989ء) لکھتے ہیں:

---

[1] سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 246، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

"میں جب قدیم فلسفے کو پڑھنے بیٹھا تو ان بزرگوں کی سبھی باتوں پر حسنِ ظن نہیں رکھتا تھا کیوں کہ اس سے پہلے جدید علوم کے ماہرین کے نظریات کی ان پرانے فلسفیوں کی طبیعات اور فلکیات کے مخالف ہونے کو اجمالی طور پر جان چکا تھا۔۔۔ میرے ذہن میں یہ بات کھٹکتی رہتی تھی کہ یہ لوگ، جو طبیعیات میں غلط تھے، کیسے ممکن ہے کہ الٰہیات میں خطا سے پاک رہے ہوں؟[1]"

آیۃ اللہ صافی گلپائگانی (متوفی 2022ء) فرماتے ہیں:

"ان حضرات نے اپنی تھیوریوں کی بنیاد پر مخلوقات کا فرضی نقشہ بنا رکھا تھا۔ اپنے گمان میں کائنات اور آسمانوں کے مقام کو متعین کر کے حادث و قدیم کا تعلق اور واحد سے کثیر کے صدور کی داستان تدوین کر لی تھی۔ گویا یہ ہر جگہ اور کائنات کے تحولات اور ادوار میں خدا کے ساتھ تھے۔ اس بنیاد پر مجردات اور عقول کی دنیاؤں کا افسانہ گھڑ کر خیالی سلسلے بنا بیٹھے تھے کہ جدید سائنس اور آرٹس کے آنے سے ان کا باطل ہونا پہلے سے زیادہ واضح ہو گیا۔[2]"

---

[1] آیۃ اللہ جواد تہرانی، "عارف وصوفی چہ می گویند"، صفحہ 323، نشر آفاق، تہران، 2010ء۔

[2] آیۃ اللہ العظمیٰ صافی گلپائگانی، "شرح حدیث عرضِ دین حضرت عبد العظیم حسنی"، صفحہ 107، قم، 2015ء۔

4. عللِ اربعہ

فلسفۂ ملا صدرا کے صفحہ 384 پر ایک باب شروع ہوتا ہے جس میں علت کی چار قسمیں بیان ہوئی ہیں: علتِ مادی، علتِ صوری، علتِ فاعلی اور علتِ غائی، اس کے بعد کئی صفحات پر فرضی گفتگو کرتے کرتے صفحہ 475 پر ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"دی مقراطیس Democritus (متوفی 370 قبلِ مسیح) کا خیال ہے کہ عالم کا وجود محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔ اور اس کی دلیل میں اس کی تقریر یہ تھی کہ عالم کے مبادی ایسے چھوٹے چھوٹے اجرام وذرات ہیں جن کی ان کی سختی کی وجہ سے تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ یہ ذرات اس خلاء اور فضا میں جو غیر محدود ہے، بکھرے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان ذروں کی فطرت اور طبیعت تو واحد ہے لیکن ان کی شکلیں مختلف ہیں اور وہ ہمیشہ دائمی حرکت اور گردش کے ساتھ متحرک رہتے ہیں۔ اتفاقاً انہی ذرات کے کسی مجموعے کی دوسرے مجموعے سے مڈبھیڑ ہو گئی اور ایک خاص شکل میں وہ اکٹھے ہو گئے۔ اسی سے عالم کی پیدائش ہوئی۔ عالم کے متعلق اگرچہ دی مقراطیس اسی خیال کا قائل تھا لیکن اسی کے ساتھ حیوانات و نباتات کی پیدائش کے متعلق وہ اتفاق کا مدعی نہیں تھا۔ انباذقلیس Empedocles (متوفی 434 قبلِ مسیح) یہ کہتا تھا کہ عنصری اجسام کی پیدائش تو اتفاق کے قانون کے تحت اس طرح ہوئی ہے کہ ذرات کے جس مجموعے میں

باقی رہنے اور نسل بڑھانے کی صلاحیت تھی، وہ مجموعہ تو باقی رہ گیا اور اتفاقاً جن میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہوسکی وہ باقی بھی نہ رہ سکے۔[1]"

اس کے بعد ملا صدرا اس قول کو غلط دلائل سے رد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ظنی خیالات جدید زمانے میں دریافت ہونے والے ایٹم کے تصور اور نظریۂ ارتقاء سے بہت مختلف اور غلطیوں سے پُر ہیں۔ البتہ جدید علوم میں یہ سامنے آیا ہے کہ بعض مظاہر کی کوئی علت نہیں ہوتی، جیسے اتفاقات کی کوئی علتِ غائی نہیں ہوتی۔ اس کی ایک مثال پانی میں تیرتے ہوئے ذرے کی حرکت (brownian motion) کی ہے جس کی تفصیل انٹرنیٹ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح بعض مظاہر کی کوئی علتِ مادی نہیں ہوتی ہے۔ عللِ اربعہ کے تصور کا ہر معاملے میں اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اب اتفاقات کو سمجھنے کے لیے ایک علیحدہ علم ترتیب پاچکا ہے جسے علمِ شماریات (statistics) کہتے ہیں۔ پاکستان کی تقریباً ہر بڑی یونیورسٹی میں اس مضمون کے لیے الگ شعبہ قائم ہے، جس میں ہر سال کئی طالب علم تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں اہم ذمہ داریاں نبھاتے ہیں۔ دلچسپی رکھنے والے لوگ وہاں جا کر لائبریری میں موجود کتب کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی مدد سے بہت سے مسائل حل کئے جا رہے ہیں اور سائنس میں بھی یہ علم استعمال ہوتا ہے۔ البتہ ملا صدرا اتفاق کی سرے سے نفی

---

[1] سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 475، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

کرتے ہیں اور اس بات کو جعلی روایت قرار دیتے ہیں جسے کسی نے بعد میں ان فلسفیوں سے منسوب کر دیا۔

5. عورت دشمنی

خواتین سے ملا صدرا کو خاص چڑ ہے۔ وہ خواتین کو حیوانِ صامت سمجھتے ہیں [1] اور نوخیز لڑکوں سے محبت کے فضائل بیان کرتے ہوئے خواتین سے عشق کو گھٹیا قوموں کا شیوا قرار دیتے ہیں۔[2] ہیولیٰ قدیم فلسفے کی ایک اصطلاح ہے جو اب مردود ہو چکی ہے اور اس کا واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ملا صدرا کے غیض و غضب کا بھی نشانہ بنتی رہتی ہے۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ملا صدرا اس کی برائی کو ظاہر کرنے کے لیے اسے خواتین سے نسبت دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''ہیولیٰ اولیٰ خسّت و دنائت کا سرچشمہ ہے اور برائیوں کے دائرے کا مرکزی نکتہ ہے۔ گویا اس کی صورت ایک کریہ المنظر بڑھیا کی سی ہے۔ اس کو نور اور روشنی سے قطعاً اس

---

[1] ملا صدرا، ''اسفار اربعہ''، جلد 7، صفحہ 136، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

[2] ملا صدرا، ''اسفار اربعہ''، جلد 7، صفحہ 172، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

وقت تک کوئی واسطہ نہیں ہوتا جب تک کہ صورتِ جسمیہ اور نوعیہ کے لباس کو یہ زیبِ تن نہ کر لے۔"[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"اس خاص صورت کے حصول کے بعد بھی باقی صورتوں کی خواہش اور ان کا اشتیاق ہیولٰی میں پھر بھی باقی رہتا ہے۔ اس کی مثال ٹھیک اس عورت کی ہے جو ایک مرد سے ہم بستری سے سیر نہیں ہوتی، بلکہ اس میں مسلسل ایک کے بعد دوسرے مرد کی سوزش اور تڑپ پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔"[2](فلسفۂ ملا صدرا، صفحہ 466)

کتاب میں اور بھی بہت کچھ ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ زمین پر آگ لگنے کو آسمانوں میں ستاروں کے ٹکرانے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔[3] بیماریوں کو صفراء اور سوداٗ جیسی فرضی رطوبتوں اور مزاج کے فساد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ بیکٹیریا اور وائرس جیسے جراثیم کے کردار یا انسانی بدن کی ساخت سے بالکل ناواقف ہیں۔

---

[1] سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 329، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

[2] سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 466، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

[3] سید مناظر احسن گیلانی، "فلسفۂ ملا صدرا"، صفحہ 484، ترجمہ اسفار اربعہ، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

8. ملا صدرا کے ہاں زمین ساکن ہے

یونانی فلاسفہ زمین کو ساکن سمجھتے تھے۔ یہ بدیہی بھی ہے، لیکن ہر بدیہی بات درست نہیں ہوتی۔ انسان ہمیشہ سے رات کو ستاروں کو مقام بدلتے دیکھتا آیا ہے اور یہ سمجھتا رہا ہے کہ آسمان زمین کا چکر لگا رہا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ زمین کے اپنے محور کے گرد گھومنے سے ایسا لگتا تھا کہ ستارے اور سورج زمین کا چکر لگا رہے ہیں۔ یہ بات ملا صدرا کی پیدائش سے تیس سال قبل کوپرنیکس نے واضح کر دی تھی۔ لیکن ملا صدرا نے اپنی کتاب المبدا والمعاد میں آسمان کی حرکت کی وضاحت کے لیے ایک فصل قائم کی ہے، فصل فی ان محرک السماء لا یجوز ان یکون عقلا محضا، اس میں فرماتے ہیں:

لا تقبل التغير كما لا يجوز أن يكون طبعا محضا لأن الثابت على حالة واحدة لا يصدر منه إلا ثابت على حالة واحدة فيجوز مثلا أن يكون سكون الأرض مثلا عن علة ثابتة لأنه دائمة على حالة واحدة[1] .

ترجمہ: ''عقلِ محض میں تبدیلی نہیں آتی۔ جیسا کہ اس کے لیے طبعِ محض ہونا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ایک حالت میں ٹھہرے رہنے والے سے جو صادر ہو وہ بھی ایک حالت

---

[1] ملا صدرا، ''المبدا والمعاد''، صفحہ 278، تصحیح: سید جلال الدین آشتیانی، طبع سوم، 2001ء۔

میں ہی ٹھہرے رہنے والا ہو گا۔ مثلاً زمین کا ساکن رہنا اس دلیل سے جائز ہے کہ یہ دائماً ایک ہی حالت پر ٹھہری ہوئی ہے۔''

ملا صدرا کے لیے یہ بات تو طے ہے کہ آسمان زمین کے گرد گھومتا ہے اور زمین ساکن ہے۔ اب اس آسمان کا محرک کون ہے؟ تو اسکی کھوج لگائی جا رہی ہے مگر خالی الفاظ کے ہیر پھیر، یعنی برہان، سے کام چلایا جا رہا ہے۔ نہ وہ ریاضی کا استعمال کرتے ہیں نہ ہی خارجی حقائق کے ڈیٹا کو خاطر میں لاتے ہیں۔ ان کو کشش ثقل کی سمجھ بھی نہیں تھی۔ آگے چل کے صفحہ 279 پر یہ بتایا جا رہا ہے کہ آسمان شہوت یا غصے میں آکر حرکت نہیں کرتا، بلکہ اس کا سبب کچھ اور ہے:

حركة السماء كما أنها ليست شهوية ولا غضبية لتعاليها عن الأغراض الحيوانية بل نفسانية كذلك ليست صدورها عن النفس اهتماما بحال العالم السفلى وتدبير الأجسام العنصرية لحقارتها بالنسبة إليه. والعالى لا يلتفت إلى السافل وإن وصل فيضه إليه[1] .

ترجمہ: ''آسمان کی حرکت چونکہ حیوانی اغراض سے بہت بلند ہے لہٰذا یہ شہوت یا غضب کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ یہ نفسانی معاملہ نہیں کیونکہ یہ حرکت نفس کے عالمِ سفلی کے اہتمام اور عنصری اجسام کو سنبھالنے کی خاطر نہیں ہوتی۔ اعلیٰ کبھی ادنی چیزوں میں نہیں پڑتا۔''

---

[1] ملا صدرا، ''المبدا و المعاد''، صفحہ 279، تصحیح: سید جلال الدین آشتیانی، طبع سوم، 2001ء۔

یہ خیال باقی جاری رہتی ہے اور صفحہ 282 پر آسمانی اجرام کی حرکت کا سبب عقول کو بنا دیا گیا ہے۔

وہذه العقول التی ہی فواعل الجواہر السماوية ينبغی أن يكون ہی المعشوقات وغاية الحركات لنفوس السماوات لأن التفات كل شیء فی استكماله وطلبه الخير إلى ما ہو علته وإلى طلب ما ہو التشبه به[1] .

ترجمہ: ''نفوسِ آسمانی کی حرکت کی غایت اور ان کی معشوقائیں ان عقول کو ہونا چاہئے جو جواہرِ سماوی کی فعلیت ہیں۔ کیونکہ ہر چیز اپنی تکمیل میں اور طلب خیر میں اپنی علت کی طرف پلٹتی ہے اور اس کی طلب کرتی ہے جو اس سے شباہت رکھتی ہے۔''

یہاں ہر چیز کا اپنی اصل کی طرف پلٹنا وہی ارسطو کا نظریۂ حرکت ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو بار بار عقل کا لفظ استعمال جارہا ہے، یہ عقل ہی ہے یا کوئی اور فرضی چیز ہے؟ اس کا جواب فلوطین کی خیالی دنیا میں ملے گا۔

ارسطو کا نظریۂ حرکت

ارسطو کسی چیز کے استعداد سے فعلیت میں بدل جانے کو حرکت کہتا ہے۔ یہ درست تعریف نہیں اور حرکت کے مفہوم کا مکمل احاطہ نہیں کرتی۔ ارسطو یہ سمجھتا تھا کہ چونکہ زمین مٹی اور پانی سے بنی اشیاء کی اصل ہے تو اسلیے یہ چیزیں اس کی طرف گرتی ہیں۔ آگ اور ہوا کی

---

[1] ملا صدرا، ''المبدا والمعاد''، صفحہ 282، تصحیح: سید جلال الدین آشتیانی، طبع سوم، 2001ء۔

اصل آسمان ہے، لہٰذا وہ اوپر جاتے ہیں۔ یوں وہ لفظی کڑیاں ملا کر برہان سے اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ بھاری چیزوں کو جلدی زمین پر آنا چاہئے۔ وہ خلا کو اسلیے محال سمجھتا ہے کہ اس میں لامتناہی حرکت ہو گی۔ ارسطو کی دنیا کو سمجھنے کی کوشش قابلِ تحسین ہے اور یہ عقل کا استعمال ہے، لیکن یہ باتیں نادرست ہیں۔ ان خیالات سے ملا صدرا کے معاصر گیلیلیو نے ہمیں نجات دی۔ جب اس نے ایک مینار سے مختلف کمیت رکھنے والی چیزیں گرا کر دیکھا کہ وہ ایک ہی رفتار سے زمین پر گریں۔ گیلیلیو نے ہی دوربین کے ذریعے مشتری کے چار چاند دریافت کئے جو ایسے آسمانی نفوس تھے جو آشکارا زمین کے علاوہ کسی اور مرکز کے گرد گھوم رہے تھے۔ اس تجربی مشاہدے نے کوپرنیکس کے تعقل کو مزید معتبر بنایا۔ بعد میں نیوٹن نے کششِ ثقل کا قانون دریافت کیا جو ابہام سے پاک ریاضی کی مساوات کی شکل میں لکھا جاسکتا تھا۔ آئن سٹائن نے اس قانون میں مزید بہتری پیدا کی۔

اعلیٰ حضرت بریلوی اور ردِ حرکتِ زمین

سائنس کی یہ باتیں مسلم عرفاء کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ علامہ ذوالفنون احمد رضا خان بریلوی (متوفی 1921ء) نے ''فوز المبین در ردِ حرکتِ زمین'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں آپ نے نہ صرف ملا صدرا کی طرح لفظی براہین پیش کئے، بلکہ قدیم ریاضی کا استعمال بھی کیا ہے۔ مختلف کرے اور شکلیں بنا کر بھی اپنا موقف واضح کیا ہے۔ اس کتاب سے علامہ موصوف کی قرون وسطی کی سائنس پر بھی گرفت کا پتا چلتا ہے، جگہ

جگہ خواجہ طوسی اور ان کے تلامذہ کے حوالے آئے ہیں۔ جو چیز علامہ ذوالفنون نہیں سمجھ سکے وہ یہ تھی کہ جدید علوم نے ان براہین کو کیسے رد کیا ہے۔ لفاظی کا ایک نمونہ دیکھئے:

''ثالثاً سماوی کرہ واقعی خواہ فرضی بالطبع ایسا ہونا لازم کہ تحت حقیقی سے اُس تک بُعد ہر جانب سے برابر ہوا۔ اس کے کوئی معنی نہیں کہ یہ مقعر ایک طرف زیادہ اونچا ہے دوسری طرف کم، تو اسے مرکز شمس پر لینا تھا کہ وہی تمہارے نزدیک تحت حقیقی ہے۔ مگر مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ وہ حسابی و ہندسی غلطیاں یونہی رفع ہوتی ہیں کہ باتباعِ قدما مرکزِ عالم مرکزِ زمین پر لیا جائے۔

رابعاً مرکزِ زمین ہو یا مرکزِ شمس یا کوئی ایک مرکزِ معین، ہیاتِ جدیدہ سب دوائر کو جن سے ہیات کا نظام بنتا ہے، ایک مرکز پر مان سکتی ہی نہیں جس کا بیان عنقریب آتا ہے۔ اور بے ایک مرکز پر مانے، ہیات کا نظام سب درہم و برہم، غرض بیچارے ہیں مشکل میں، دوائر اور ان کے مسائل سب قدما سے سیکھے اور اُنہیں کی طرح اُن سے بحث چاہتے ہیں مگر جدید مذہب والا بننے کو اصول معکوس لیے، اب نہ وہ بنتے ہیں نہ یہ چھوٹتے ہیں، سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہیں۔ آسمان گما کر سورج تھما کر جاذبیت کے مثل ہاتھوں سیارے گھما کر، چار طرف ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور بنتی کچھ نہیں۔ بعونہٖ تعالے یہ سب بیان عیاں ہو جائے گا و باللہ التوفیق۔[1] ''

---

[1] امام احمد رضا خان بریلوی، ''فوز مبین در ردِ حرکتِ زمین''، صفحہ 285، اعلیٰ حضرت نیٹ ورک۔

آیت اللہ خمینی نے سائنس پر پابندی نہ لگائی

آیت اللہ خمینی کے شاگرد جناب عباس زریاب خوئی کے مطابق آیت اللہ خمینی بھی نظری طور پر جدید سائنس کے مخالف تھے۔ لیکن چونکہ اس کا اثبات تجربے سے ہو رہا تھا تو اس کی تاویل کرتے تھے تاکہ بطلیموسی ہیئت کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اسی طرح مادے اور جسم کے بارے جدید فزکس کے ایٹم جیسے تصورات کو درست نہیں سمجھتے تھے اور اس کے برعکس مادے اور جسم کو سمجھنے کے لیے ہیولا اور صورت جیسے مفاہیم پر اعتقاد رکھنا لازم سمجھتے تھے۔[1] البتہ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب ان کو حکومت ملی تو انہوں نے عمل میں جدید سائنس پر پابندی نہیں لگائی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں فرمایا:

"میرے لیے ضروری ہے کہ میں ایک نکتے کی وضاحت کروں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ تعلیمی اداروں کی اصلاح سے ہمارا مقصد کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ شاید سائنس کی دو قسمیں ہیں: اسلامی اور غیر اسلامی، مثلاً اسلامی انجینئرنگ اور غیر اسلامی انجینئرنگ یا اسلامی طبیعیات اور غیر اسلامی طبیعیات، چنانچہ انہوں نے اعتراض کیا کہ علم تو اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف کچھ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ تعلیمی اداروں کو اسلامی بنانے سے مراد صرف مذہب سے متعلقہ علوم پڑھانا ہے، جیسے

---

[1] عباس زریاب خوئی، "زندگانی من"، صفحات 50، 51، مجلہ تحقیقات اسلامی، شمارہ 1 و 2، سال 1374 شمسی۔

فقہ، اصول اور تفسیر، دوسرے لفظوں میں ان کو قدیم دور کے مدرسے بنانا ہے۔ یا تو انہوں نے بات کو نہیں سمجھا یا جان بوجھ کر خود کو اس دھوکے میں ڈالا ہے۔[1]"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایرانی مدارس میں اسلامی فلسفے کے نام پر ہیولا اور صورت جیسے تصورات چھائے ہیں تو ایرانی یونیورسٹیوں نے سائنس کو ترک نہیں کیا۔

مسلم فلسفہ اور ہٹ دھرمی

یوں تو فلسفے کا لفظی معنی عقل کی محبت ہے لیکن ماضی میں مسلمانوں نے جب یونانی فلسفے کو ترجمہ کیا تو اسے ایک مذہب یا دھرم کی طرح اپنایا۔ لہٰذا لوگ عموماً کسی ایک مکتب کو اپناتے اور اسے ہی فلسفہ قرار دیتے باقی مکاتب کو فلسفہ ماننے سے انکار کر دیتے۔ اسی لیے جن علماء نے ان کا رد بھی کیا تو اسے مذہبِ فلاسفہ کہہ کر رد کیا۔ یہ لوگ اول تو اختلاف رکھنے والے کو متفلسف، یا فلسفی نما، کہتے۔ اگر کسی کو فلسفی مانتے مگر اسکی کسی رائے سے متفق نہ ہوتے تو یا تو یہ کہتے کہ یہ جان بوجھ کر غلط بات کر رہا ہے یا یہ کہتے کہ یہ بات اس سے غلط منسوب کر دی گئی ہے۔ اسکی مثالیں یوں تو مشائیوں، اشراقیوں اور صدرائیوں میں بہت ملتی ہیں، لیکن یہاں دو کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔ ارسطو کی طرف سے افلاطون کے عالمِ مثال کے مفروضے کو

---

[1] آیت اللہ خمینی کا یونیورسٹیوں کے وفد سے خطاب، "صحیفہ امام (انگریزی ترجمہ)"، جلد 12، صفحہ 217، بتاریخ 21 اپریل 1980، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران۔

رد کرنے پر ملا صدرا ذاتیات پر اتر کر گھٹیا الزامات لگاتے ہیں [1] اور انباذ قلس کی کسی بات سے متفق نہیں تو کہتے ہیں کہ ممکن ہے اس پر یہ جھوٹ باندھا گیا ہو۔ [2] ابنِ رشد بھی فلسفے کو عقیدے کی طرح تھامے ہوئے تھا۔ یہ روش معاصرین میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً جناب مرتضٰی مطہری جدید فلسفے کو فلسفہ ماننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جناب ڈاکٹر حسین نصر صاحب یہ کہتے ہیں کہ میں نے 19 سال کی عمر میں حقیقت کو پالیا تھا اور پھر ہمیشہ اس پر ڈٹا رہا۔ اصل میں یہ حضرات عقل کو ایک عجیب و غریب مخلوق سمجھتے ہیں اور اس فرضی موجود کی محبت کو فلسفہ سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقی عقل کو نہیں جانتے، لہٰذا ان میں فلسفے کی طرف میلان کا مطلب حقیقت کی تلاش، تنقیدی سوچ اور منطقی روش نہیں بلکہ کچھ خاص عقائد ہیں جن پر ڈٹ جانے کا نام انہوں نے فلسفہ رکھا ہوا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس عقل سے پیار کرنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، دوسرے کا پیار، سچا پیار نہیں۔ ایک مسلم فلسفی کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ عقلمند صرف وہ خود ہے، چاہے جتنا بھی جاہل ہو۔ اسی ہٹ دھرمی کے سبب حرکت اور زمین و آسمان کے بارے انکے نظریات بھی قدیم یونانیوں کی پیروی پر مبنی ہیں۔ مسلمان علماء میں سے جنہوں نے فلاسفہ کی مخالفت کی، وہ تنقیدی سوچ رکھتے تھے اور ان کی نسبت کم ہٹ دھرم تھے۔

---

1 فلسفۂ ملا صدرا، ترجمہ اسفار اربعہ، صفحہ 341، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

2 فلسفۂ ملا صدرا، ترجمہ اسفار اربعہ، صفحہ 479، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

9. ہم جنس پسندی اور مُلا صدرا

عرفان یا تصوف، یعنی اپنے احساسات کو خطاء سے پاک علم سمجھنا اور دماغی محنت سے حاصل ہونے والے علمِ حصولی کو عبث قرار دینا، مختلف تہذیبوں میں رہا ہے۔ یونان میں افلاطون تو ہندوستان میں اپنشاد لکھنے والوں نے اسکی ترویج کی۔ اسلام سے قبل مکہ سے سکندریہ تک سمندری راستے سے تجارت ہوتی تھی اور وہاں فلوطین (متوفی 270ء) کا مکتبِ فکر غالب آ چکا تھا کہ جو افلاطون کے افکار میں ہندی اپنشاد کی آمیزش سے وجود میں آیا تھا۔[1] چنانچہ مکہ میں عمرو ابن ہشام جیسے لوگ، جسے بعد میں ابو جہل کے لقب سے یاد کیا گیا، موجود تھے جو اس دور کے غالب فلسفے سے متاثر تھے۔ عرفان یا تصوف مسلمانوں میں اس وقت سامنے آیا جب عباسی دور میں ہندو اور قدیم یونانی اساطیر کے عربی میں تراجم ہوئے۔ عباسی دور میں صرف تراجم نہیں ہوئے، بلکہ ان اساطیر پر عمل کرنے والے لوگ بھی جب مسلمان ہوئے تو وہ اپنے ذہنی ورثے کو ساتھ لے کر آ گئے اور اسلام کی تعبیر اسی پسِ منظر میں کی۔ معروف صوفی بزرگ بایزید بسطامی (متوفی 874ء) کے استاد بو علی سندھی مسلمان ہونے سے پہلے ہندو جوگی تھے۔[2] مسلم عرفان کو ابنِ عربی (متوفی 1240ء) نے عروج بخشا اور ان کے بعد روحانی بزرگوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ اسی دور میں بزرگوں میں

---

[1] A. H. Armstrong, "Plotinus and India", The Classical Quarterly, Vol. 30 (1), pp. 22-28, Cambridge University Press, 1936.

[2] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، صفحہ 36، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1975ء۔

اپنے شاگردوں کا جنسی استحصال کرنا اس قدر عام ہو گیا کہ تاریخ نویسوں کی نگاہوں میں آنے لگا۔ ابن کثیر دمشقی (متوفی 1373ء) لکھتے ہیں:

وهي فاحشة اللواط، التي قد ابتلي بها غالب الملوك والأمراء، والتجار والعوام، والكتاب والفقهاء، والقضاة ونحوهم، إلا من عصم الله منهم[1].

ترجمہ: "لواط کے گناہ میں اکثر بادشاہ اور افسران، تاجر اور عوام، کاتب، فقہاء اور قاضی وغیرہ ملوث ہیں، سوائے ان کے جن پر اللہ کا خاص کرم ہو۔"

شہروں سے دور خانقاہوں میں ریاضت کرنے والوں میں بھی یہ رواج پھیل گیا کیوں کہ وہ صرف ہم جنسوں سے ہی اختلاط کر پاتے تھے۔ ان کے افلاطون جیسے پیشرو بھی ہم جنس پسندی کے حامی رہے تھے۔ چنانچہ مولانا روم (متوفی 1273ء) کہتے ہیں:

صوفی ای گشتہ بہ پیش این لئام

الخیاطۃ واللواطۃ والسلام[2]

---

1 ابن کثیر دمشقی، "البدایہ والنہایہ"، جلد 9، صفحہ 174، دار الکتب العلمیہ، لبنان۔

2 مولانا روم، "مثنوی رومی"، دفتر پنجم، صفحہ 48، سببِ آنکہ فَرَجی رانامِ فَرَجی نہادند از اوّل، سب رنگ کتاب گھر، دہلی۔

ترجمہ: ''آج کل پست قسم کے صوفیوں کا کام بس یہی رہ گیا ہے کہ خرقہ سی لو اور لواط کرنے لگو۔''

ملا صدرا (متوفی 1640ء) نے عرفانِ نظری کی معروف کتاب اسفارِ اربعہ میں ''حساس لوگوں کا نو عمر خوبصورت لڑکوں سے عشق'' کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے، في ذكر عشق الظرفاء والفتيان، جس میں اس معاملے پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں[1]:

اعلم أنه اختلف آراء الحكماء في ہذا العشق وماہيته وانه حسن أو قبيح محمود أو مذموم فمنهم من ذمه وذكر انه رذيلة وذكر مساويه وقال إنه من فعل البطالين والمعطلين ومنهم من قال إنه فضيلة نفسانية ومدحه وذكر محاسن أہله وشرف غايته ومنهم من لم يقف على ماہيته وعلله وأسباب معانيه وغايته ومنهم من زعم أنه مرض نفساني ومنهم من قال إنه جنون الهي.

''جان لو کہ اس محبت اور اس کی ماہیت کے بارے میں فلاسفہ کے اقوال مختلف ہیں۔ کچھ اسے اچھا اور کچھ بُرا سمجھتے ہیں، کچھ اسے اچھے الفاظ میں سراہتے ہیں تو کچھ اسے گھٹیا حرکت سمجھتے ہیں اور اس کو بے کار لوگوں کا کام سمجھتے ہیں- کچھ اسے روحانی فضیلت سمجھتے ہیں اور اس کی مدح کرتے ہیں اور یہ کام کرنے والوں کی خوبیاں گنواتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی

[1] ملا صدرا، ''اسفار اربعہ''، جلد 7، صفحہ 171 تا 174، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

نیت اچھی ہوتی ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس کی ماہیت اور علت واسباب کو نہیں جانااور کچھ نے اسے نفسیاتی بیماری قرار دیا تو کچھ اسے روحانی جنون سے تعبیر کرتے ہیں۔"

والذي يدل عليه النظر الدقيق والمنهج الأنيق وملاحظة الأمور عن أسبابها الكلية ومباديها العالية وغاياتها الحكمية ان هذا العشق أعني الالتذاذ الشديد بحسن الصورة الجميلة والمحبة المفرطة لمن وجد فيه الشمائل اللطيفة وتناسب الأعضاء وجوده التركيب لما كان موجودا على نحو وجود الأمور الطبيعية في نفوس أكثر الأمم من غير تكلف وتصنع فهو لا محاله من جمله الأوضاع الإلهية التي يترتب عليها المصالح والحكم فلا بد ان يكون مستحسنا محمودا سيما وقد وقع من مباد فاضله لأجل غايات شريفة.

"اور گہرائی میں جا کر نفیس اندازِ فکر سے مطالعہ کیا جائے اور ان معاملات کے کلی اسباب اور اعلیٰ مبادی اور حکیمانہ مقاصد کو دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ عشق حسین چہرے کی خوبصورتی سے حاصل ہونے والی شدید لذت کا نام ہے۔ یہ وہ پابندیاں توڑنے والی محبت ہے جو کسی کی لطیف اداؤں، اس کے اعضاء کے تناسب اور اسکے بدن کی ترکیب سے ہو جائے۔ یہ ماضی میں اکثر اقوام میں فطری طور پر، کسی تکلف اور تصنع کے بغیر، پایا جاتا تھا۔ یہ لامحالہ روحانی عظمتوں میں سے ہے کہ جس میں کوئی حکمت اور مصلحت ہو گی۔ لہٰذا اسے ایک مستحسن اور اچھا کام ہونا چاہیے کیوں کہ یہ شریفانہ مقاصد کے حصول کے لیے رائج ہوا ہے۔"

اما المبادي فلانا نجد أكثر نفوس الأمم التي لها تعليم العلوم والصنائع اللطيفة والآداب والرياضيات مثل أهل الفارس وأهل العراق وأهل الشام والروم وكل قوم فيهم العلوم الدقيقة والصنائع اللطيفة والآداب الحسنة غير خاليه عن هذا العشق اللطيف الذي منشأه استحسان شمائل المحبوب ونحن لم نجد أحدا ممن له قلب لطيف وطبع دقيق وذهن صاف ونفس رحيمة خاليا عن هذه المحبة في أوقات عمره.

”اصول کی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان قوموں میں اس کا رواج ملتا ہے جن کے ہاں مختلف علوم، فنونِ لطیفہ، ادب اور ریاضی کی تعلیم ہوتی ہے، جیسے کہ اہلِ فارس، اہلِ عراق، اہلِ شام و روم ہیں۔ نیز وہ تمام اقوام جن میں دقیق علمی کام ہوتا ہے اور ان کی صنعت میں نزاکتوں کا خیال رکھا جاتا ہے اور جنہوں نے مہذب زندگی کو اپنا لیا ہے، وہ اس لطیف عشق سے محروم نہیں ہیں کہ جس کا منشاء محبوب کی اداؤں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں اور ہم نے اپنی ساری زندگی میں کوئی ایسا شخص نہیں پایا جس کا دل نرم، طبیعت نازک، سوچ پاکیزہ اور روح مہربان ہو اور وہ اس محبت سے عاری ہو۔“

ولكن وجدنا سائر النفوس الغليظة والقلوب القاسية والطبائع الجافية من الأكراد والاعراب والترك والزنج خاليه عن هذا النوع من المحبة وانما اقتصر أكثرهم على محبه الرجال للنساء ومحبة النساء للرجال طلبا للنكاح والسفاد كما في طباع سائر الحيوانات المرتكزة فيها حب الازدواج والسفاد والغرض منها في الطبيعة ابقاء النسل وحفظ الصور في هيولياتها بالجنس والنوع إذ كانت الاشخاص دائمة السيلان والاستحالة.

''لیکن ہم نے کردوں، بدوؤں، ترکوں اور حبشیوں جیسی کثیف، سخت دل اور خشک فطرت اقوام کو اس قسم کی محبت سے عاری پایا ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر مرد عورتوں سے محبت اور عورتیں مردوں سے محبت تک ہی محدود رہتی ہیں۔ یہ حیوانوں کی طرح بس جنسِ مخالف سے ہم بستری اور پست خواہشات کو پورا کرنے پر متمرکز ہوتے ہیں، کہ جس کام سے فطرت کا مقصد محض انسانی نسل کی بقاء ہے اور ہیولوں میں اشکال کو باقی رکھنا ہے۔ پس یہ لوگ ہمیشہ سوزاک اور نامردی میں مبتلا رہتے ہیں۔''

واما الغاية في هذا العشق الموجود في الظرفاء وذوي لطافة الطبع فلما ترتب عليه من تأديب الغلمان وتربيه الصبيان وتهذيبهم وتعليمهم العلوم الجزئية كالنحو واللغة والبيان والهندسة وغيرها والصنائع الدقيقة والآداب الحميدة والاشعار اللطيفة الموزونة والنغمات الطيبة وتعليمهم القصص والاخبار والحكايات الغريبة والأحاديث المروية إلى غير ذلك من الكمالات النفسانية.

''ظریف اور لطیف طبع لوگوں میں اس عشق کی موجودگی کا مقصد نوخیز لڑکوں کو سدھانا، انکی تربیت کرنا، انہیں مہذب بنانا اور انہیں نحو، لغت، بیان اور حساب وغیرہ جیسے علوم پڑھانا اور دقیق مہارتیں سکھانا ہے۔ پسندیدہ آداب، موزوں و لطیف اشعار اور پاک صاف ترانے یاد کرانا اور قصے، تاریخ، حکمت کے نایاب موتی اور احادیث پڑھا کر ان میں نفسانی کمالات پیدا کرنا ہے۔''

فان الأطفال والصبيان إذا استغنوا عن تربيه الاباء والأمهات فهم بعد محتاجون إلى تعليم الاستادين والمعلمين وحسن توجههم

والتفاتهم إليهم بنظر الاشفاق والتعطف فمن أحل ذلك أوجدت العناية الربانية في نفوس الرجال البالغين رغبه في الصبيان وتعشقا ومحبه للغلمان الحسان الوجوه ليكون ذلك داعيا لهم إلى تأديبهم وتهذيبهم وتكميل نفوسهم الناقصة وتبليغهم إلى الغايات المقصودة في ايجاد نفوسهم والا لما خلق الله ہذه الرغبة والمحبة في أكثر الظرفاء والعلماء عبثا وہباء فلا بد في ارتكاز ہذا العشق النفساني في النفوس اللطيفة والقلوب الرقيقة غير القاسية ولا الجافية من فائدة حكمية وغاية صحيحه[1].

''کیوں کہ بچے اور نو عمر لڑکے جب اپنے ماں باپ کی تربیت سے فارغ ہو لیتے ہیں تو انہیں استادوں اور معلمین سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان کی توجہ اور محبت کے محتاج ہوتے ہیں، ان کی شفقت بھری نگاہ اور پیار کے طالب ہوتے ہیں، اس لیے یہ جائز ہے۔ بڑی عمر کے مردوں کے دِلوں میں نو عمر لڑکوں کی کشش اور خوبصورت نوخیز نوجوانوں کا عشق خدا کی عنایت ہے تاکہ اساتذہ ان کو ادب سکھانے، ان کے ناقص نفوس کی تہذیب کر کے کمال تک پہنچانے، انہیں زندگی کے عالی مقاصد اور خود شناسی کی تبلیغ کرنے کی طرف مائل ہوں۔ و گرنہ خدا اس عشق کو اکثر علما اور ظریف لوگوں کے دلوں میں بلاوجہ پیدا نہ کرتا۔ اس عشق کا سنگدل اور خشک لوگوں کے بجائے لطیف روحوں اور

1 ملاصدرا، ''اسفار اربعہ''، جلد 7، صفحہ 171 تا 174، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

نازک دلوں میں پایا جانااس بات کی دلیل ہے کہ اس کا کوئی فائدہ، کوئی حکمت اور ایک صحیح مقصد ہے۔''

اپنے احساسات کو علمِ حضوری کا نام دے کر مقدس حقائق سمجھ لینے والے حضرات کی اپنے جنسی رجحانات کے بارے میں داستان سرائی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن آج کل کے زمانے میں اگر کوئی استاد اپنے شاگردوں کے بارے میں اس قسم کے خیالی پلاؤ پکا رہا ہو تو اسے ملازمت سے فوری طور پر برطرف کرنا چاہیے۔ استاد کو اپنا سماجی رتبہ استعمال کرتے ہوئے معصوم بچوں سے عشق کرنے کی آزادی نہیں ہونی چاہیے۔

10. مُلا صدرا کی خواتین سے بیزاری

ہم جنس پسندی اکثر جنسِ مخالف سے بیزاری کے ہمراہ ہوتی ہے۔ ملا صدرا (متوفی 1640ء) کی ہم جنس پسندی کی طرف ایک مضمون، بعنوان "ہم جنس پسندی اور مُلا صدرا"، میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ لواط میں مبتلا تھے، بلکہ اس سے فقط ان کی مردانہ جسمانی حسن کی طرف رغبت ظاہر ہوتی ہے۔ ملا صدرا نے اسے استاد اور شاگرد کے تعلق کا لازمہ سمجھا جبکہ استاد کو شاگرد کی ذہانت سے غرض ہوتی ہے۔ جسمانی اداؤں پر نظر رکھنے والا استاد تعلیم کو نقصان پہنچاتا ہے۔

آج کل مغربی دنیا کے بعض جدید لکھاری لواط اور پاکیزہ ہم جنس پسندی میں فرق کر رہے ہیں اور لواط کو ہم جنس پسندی کا لازمہ قرار نہیں دیتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ملا صدرا نے اس بات کو صدیوں پہلے درک کر لیا تھا۔ جہاں آج کے مابعد الجدیدیت کے قائل ادیب پہنچے ہیں، وہاں یہ بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ البتہ تعجب ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ملا صدرا سے کبھی آئن سٹائن کا نظریۂ نسبیت برآمد کرتے ہیں تو کبھی اسے اٹامک تھیوری کا بانی قرار دیتے ہیں، جبکہ نہ انہیں ان کا کچھ پتا ہے نہ ملا صدرا بیچارے کو ان جدید ریاضی پر مبنی نظریات کی کچھ خبر تھی، وہ ملا صدرا کے ہم جنس پسندی والے نظریات کا کیوں ذکر نہیں کرتے کہ جنہیں اہلِ مغرب اب آ کر درک کر رہے ہیں؟

اگرچہ ہم جنس پسندی والی فصل میں ہی ملا صدرا نے جنسِ مخالف سے محبت کو بُرا سمجھا ہے اور خواتین کے جسمانی حسن کی طرف ملتفت نہیں اور نکاح کی توجیہ محض اولاد پیدا کرنے کی مجبوری سے کی ہے۔[1] انہوں نے خواتین سے محبت کو گھٹیا قوموں کا شیوہ قرار دیا ہے جس سے ملا صدرا کی نسل پرستی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں اسی ناول، اسفار اربعہ، سے ایک اور عبارت پیش کی جارہی ہے جو ملا صدرا کی خواتین سے بیزاری کو ظاہر کرتی ہے۔

بیروت میں شائع شدہ اسفارِ اربعہ کی ساتویں جلد کے صفحہ 127 پر ایک فصل شروع ہوتی ہے جس کا عنوان انسان کی خلقت کی حکمت ہے۔ صفحہ 134 پر اگلی فصل شروع ہوتی ہے جس کا عنوان زمین اور اس پر موجود انسان کے فائدے کی چیزوں کی خلقت کی غرض و غایت کا بیان ہے۔ اس میں صفحہ 136 پر خواتین کو حیوانات میں شمار کیا ہے۔ اسی صفحے پر حاشیے میں ملا ہادی سبزواری جیسے عارف نے ملا صدرا کے خواتین کو جانوروں میں شمار کرنے کی توضیح پیش کی ہے اور ان کے لیے حیوانِ صامت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لکھا ہے:

و منها تولد الحيوانات المختلفة؛ وَ بَثَّ فِيها مِنْ كُلِّ دَابَّة بعضها للأكل وَ الْأَنْعامَ خَلَقَها لَكُمْ فِيها دِفْءٌ وَ مَنافِعُ وَ مِنْها تَأْكُلُونَ و بعضها للركوب و الزينة وَ الْخَيْلَ وَ الْبِغالَ وَ الْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوها وَ زِينَة و بعضها للحمل وَ تَحْمِلُ أَثْقالَكُمْ إِلى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بالِغِيه إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُفٌ رَحِيمٌ و بعضها للتجمل و الراحة وَ لَكُمْ

---

[1] ملا صدرا، ''اسفار اربعہ''، جلد 7، صفحہ 172، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

فِيها جَمالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَ حِينَ تَسْرَحُونَ و بعضها للنكاح وَ اللَّه جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْواجاً و بعضها للملابس و البيت و الأثاث وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعامِ بُيُوتاً تَسْتَخِفُّونَها يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ إِقامَتِكُمْ- وَ مِنْ أَصْوافِها وَ أَوْبارِها وَ أَشْعارِها أَثاثاً وَ مَتاعاً إِلى حِينٍ[1].

ترجمہ: ''اور انہی نعمتوں میں مختلف حیوانات کی خلقت بھی شامل ہے،وَ بَثَّ فِيها مِنْ كُلِّ دَابَّة(اور زمین میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیئے: سورہ بقرہ، آیت 164)۔ جن میں سے بعض کو کھانے کے لیے بنایا،وَ الْأَنْعامَ خَلَقَها لَكُمْ فِيها دِفْءٌ وَ مَنافِعُ وَ مِنْها تَأْكُلُونَ (اور چوپائے، جن میں تمہارے لیے گرم لباس ہیں اور منافع ہیں اور بعض تمہارے کھانے کے کام آتے ہیں: سورہ نحل، آیت 5)۔ بعض سواری اور زینت کے کام آتے ہیں،وَ الْخَيْلَ وَ الْبِغالَ وَ الْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوها وَ زِينَة(گھوڑوں کو، خچروں کو، گدھوں کو اس نے پیدا کیا کہ تم ان کی سواری لو اور وہ باعثِ زینت بھی ہیں: سورہ نحل، آیت 8)۔ اور بعض بار برداری کے کام آتے ہیں،وَ تَحْمِلُ أَثْقالَكُمْ إِلى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بالِغِيه إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُفٌ رَحِيمٌ (اور وہ تمہارے بوجھ ان شہروں تک اٹھالے جاتے ہیں جہاں تم بغیر آدھی جان کئے پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ یقیناً تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور نہایت مہربان ہے: سورہ نحل، آیت 7)۔ اور بعض جانور تجمل اور راحت کے لیے ہیں،وَ لَكُمْ فِيها جَمالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَ حِينَ تَسْرَحُونَ (اور ان میں تمہاری رونق بھی ہے جب چرا کر لاؤ تب بھی اور جب چرانے لے

---

[1] ملاصدرا، ''اسفار اربعہ''، جلد 7، صفحہ 136، داراحیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

جاؤ تب بھی: سورہ نحل، آیت 6)۔ اور بعض اس لیے ہیں کہ ہم ان سے نکاح کریں، وَ اللَّه جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْواجاً(اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تم میں سے ہی تمہاری بیویاں پیدا کیں: سورہ نحل، آیت 72)۔ بعض لباس اور گھر بنانے اور گھریلو استعمال کی اشیاء میں استعمال ہوتے ہیں،وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعامِ بُيُوتاً تَسْتَخِفُّونَها يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ إِقامَتِكُمْ وَ مِنْ أَصْوافِها وَ أَوْبارِها وَ أَشْعارِها أَثاثاً وَ مَتاعاً إِلى حِينٍ.(اور اسی نے تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں کے گھر بنا دیے ہیں، جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے ٹھہرنے کے دن بھی، اور ان کی اون اور روؤں اور بالوں سے بھی اس نے بہت سے سامان اور ایک وقت مقررہ تک کے لیے فائدہ کی چیزیں بنائیں: سورہ نحل، آیت 80)۔"

یہاں ملا صدرا نے شادی والی آیت کو جانوروں والی آیات کے سیاق وسباق کے ساتھ لکھ کر تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے۔ ایک اور صوفی فلسفی اور شاعر، ملا ہادی سبزواری (متوفی 1873ء)،اس عبارت کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

فی إدراجها فی سلک الحیوانات إیماء لطیف إلى أن النساء لضعف عقولهن و جمودهن على إدراک الجزئیات و رغبتهن إلى زخارف الدنیا کدن أن یلتحقن بالحیوانات الصامتة حقا و صدقا أغلبهن

سیرتهن الدواب و لکن کساهن صورة الإنسان لئلا یشمئز عن صحبتهن و یرغب فی نکاحهن[1].

ترجمہ: "ملا صدرا کا خواتین کو جانوروں میں شمار کرنا اس لطیف عرفانی نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ عورتیں ذہانت کی کمی اور جزئیات تک محدود رہنے اور دنیا کی زیب وزینت سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے حقیقت میں گونگے حیوانوں جیسی ہیں۔ ان کی اکثریت چوپایوں جیسی سیرت رکھتی ہے لیکن ان کو انسانی شکل میں پیدا کیا گیا تاکہ مردان سے ملاپ کرتے ہوئے کراہت محسوس نہ کریں اور ان سے نکاح کرنے میں رغبت محسوس کریں۔"

خواتین کو مردوں کے استعمال کی چیز سمجھنا اور ان کی اپنی ذاتی حیثیت کی نفی کرنا اکثر صوفیوں کے ہاں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانی (متوفی 1624ء) فرماتے ہیں:

"اللہ نے ریشم کے لباس کو عورتوں کے لیے حلال فرمادیا کہ عورتوں کی زیب وزینت کا فائدہ آخر کار مردوں کو ہی ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی چاندی سونے کا حال ہے کہ عورتوں کے زیورات کو مردوں کے لیے فائدے اور خوشی کا باعث بنادیا۔[2]"

---

1 ملا صدرا، "اسفار اربعہ"، حاشیہ: ملا ہادی سبزواری، جلد 7، صفحہ 136، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

2 شیخ احمد فاروقی سرہندی، "مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی"، دفتر اول، مکتوب 191، صفحہ 48، ادارہ مجددیہ، کراچی۔

خواتین سے بیزاری کامسئلہ اکثر مسلم فلاسفہ کو درپیش ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

؎ حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

وہ بھی خواتین کی اپنی انسانی حیثیت کے قائل نہیں۔ فرماتے ہیں:

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی

نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

11. مسلم فلسفہ اور نسل پرستی کی لعنت

فلسفے کی بنیاد یونان کے اَن پڑھ اور جاہل معاشرے میں پڑھنے لکھنے کے آغاز کے نتیجے میں پڑی۔ دیہاتوں اور قبیلوں کے سیانے بابے اپنے خیالات کو لکھتے، تبادلۂ خیال کرتے اور نئی نسل کو سکھاتے۔ باقی دنیا کے برعکس یونان کے سیاسی حالات بھی آزادئ فکر کی اجازت دیتے تھے، جو ایک مثبت چیز تھی۔ اس طرح ان کے اقوال اور تحریروں کا ایک ذخیرہ اکٹھا ہو گیا جس میں مفید چیزیں بھی تھیں، لیکن اکثر تحریریں جہالت کے پلندے کے سوا کچھ نہ تھیں۔ عقل استعمال کرنا اور دوسروں کے خیالات کو سن کر ان سے سیکھنے اور ان پر تنقید کرنے کا سلسلہ بہت اچھا تھا، لیکن اس زمانے میں نہ موجودہ دور کے وسائل تھے نہ انسانی فکر کا ورثہ موجودہ زمانے کی طرح لائبریریوں اور یونیورسٹیوں کی شکل میں ترقی پا چکا تھا، کیوں کہ ابتدائی زمانہ تھا۔ لٰہذا ان کے افکار میں غلطیاں بہت زیادہ تھیں جن سے آج کے علمی حلقے جان چھڑا چکے ہیں۔ عباسی دور سے یہ کتابیں عربی میں ترجمہ ہو کر باقاعدہ مسلمانوں کے ہاں پڑھائی جانے لگیں۔ البتہ مسلم فلسفہ کا ہزار سالہ دور کوئی بڑی جست لگانے میں ناکام رہا اور زیادہ زور یونانی اقوال کے حافظ تیار کرنے اور پیچیدہ لفاظی کا جنگل بسانے پر ہی رہا ہے۔ چنانچہ یونانی افکار کی بہت سی خامیاں مسلم فلسفیوں کے ہاں بھی ملتی ہیں جن میں سے ایک نسل پرستی کی لعنت بھی ہے۔

شاہ ولی اللہ (متوفی 1762ء) لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو، خواہ وہ کسی بھی ملک میں اپنی ابتدائی زندگی گزاریں، لیکن بہر حال اپنی وضع قطع اور طرز بود وماند میں اس ملک کے مقامی باشندوں سے قطعی جدا رہنا چاہیے۔اور جہاں کہیں رہیں،اپنی عربی شان اور عربی رجحانات میں ڈوبے رہیں۔[1] "

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"خبر دار! بچے رہنا۔اس تونگر میں امیر سرکش، خواہ مخواہ غیروں اور عجمیوں کے طور طریقوں کوزبردستی اختیار کرتا ہے۔اور جو لوگ صحیح راہ سے منحرف ہیں،ان سے مقابلہ اور برابری میں مصروف رہتا ہے"۔[2]

جس زمانے میں شاہ ولی اللہ رہ رہے تھے، مسلمان ہندوستان کی آبادی کا دس سے پندرہ فیصد ہونگے۔ شاہ ولی اللہ کے خاندان کا دعویٰ تھا کہ وہ نسب کے لحاظ سے فاروقی ہیں، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت مقامی تھی۔ان کا رہن سہن، زبان، خوراک، لباس، خوشی و غم کے طریقے، سب مقامی تھے۔ لیکن انہیں اس سے گھن آتی تھی۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں 1746ء میں مدراس پر فرانسیسی اور 1751ء میں انگریزی قبضے پر کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی نہ ہی 1757ء میں مدراس سے آنے والی انگریزی فوج کے بنگال پر قبضے کے خلاف انہوں نے کوئی اقدام کیا، البتہ 1757ء اور 1761ء میں دہلی کی مسلم

---

[1] ڈاکٹر مبارک علی، "المیۂ تاریخ"، باب 9،10؛ صفحات 95-105؛ فکشن ہاؤس لاہور، (2012)۔
[2] ڈاکٹر مبارک علی، "المیۂ تاریخ"، باب 9،10؛ صفحات 95-105؛ فکشن ہاؤس لاہور، (2012)۔

اشرافیہ کی خاطر احمد شاہ ابدالی سے رابطے کرتے نظر آئے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ مدراس، دکن، بنگال اور بعدازاں میسور اور پنجاب میں جو ہوا وہ مقامی باشندوں کی جنگیں تھیں جن کو یہ لوگ گھٹیا سمجھتے تھے، لیکن دہلی کی مسلم اشرافیہ خود کو عرب یا ترک نسل کا برتر انسان سمجھتی تھی اور ان کی جنگ شاہ ولی اللہ خاندان کی گویا اپنی جنگ تھی۔

ملا صدرا (متوفی 1640ء) کے ہاں بھی نسل پرستی کی لعنت پائی جاتی ہے۔ آپ نوخیز لڑکوں سے عشق کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولكن وجدنا سائر النفوس الغليظة والقلوب القاسية والطبائع الجافية من الأكراد والاعراب والترك والزنج خاليه عن هذا النوع من المحبة وانما اقتصر أكثرهم على محبه الرجال للنساء ومحبة النساء للرجال طلبا للنكاح والسفاد كما في طباع سائر الحيوانات المرتكزة فيها حب الازدواج والسفاد والغرض منها في الطبيعة ابقاء النسل وحفظ الصور في هيولياتها بالجنس والنوع إذ كانت الاشخاص دائمة السيلان والاستحالة[1].

"لیکن ہم نے کردوں، بدوؤں، ترکوں اور حبشیوں جیسی کثیف، سخت دل اور خشک فطرت اقوام کو اس قسم کی محبت سے عاری پایا ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر مرد عورتوں سے محبت اور عورتیں مردوں سے محبت تک ہی محدود رہتی ہیں۔ یہ حیوانوں کی طرح بس جنسِ مخالف سے ہم بستری اور پست خواہشات کو پورا کرنے پر متمرکز ہوتے ہیں، کہ جس کام سے

---

[1] ملا صدرا، "اسفار اربعہ"، جلد 7، صفحہ 172، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

فطرت کا مقصد محض انسانی نسل کی بقاء ہے اور ہیولوں میں اشکال کو باقی رکھنا ہے۔ پس یہ لوگ ہمیشہ سوزاک اور نامردی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ''

حقیقت یہ ہے کہ لڑکوں کی طرف میلان عربوں میں بھی پایا جاتا تھا، اچھائی کی طرح برائی بھی کسی ایک قوم کی میراث نہیں ہوتی۔ معروف شامی تاریخ نویس ابن کثیر دمشقی (متوفی 1373ء) لکھتے ہیں:

وہي فاحشة اللواط، التي قد ابتلي بها غالب الملوك والأمراء، والتجار والعوام، والكتاب والفقهاء، والقضاة ونحوہم، إلا من عصم الله منهم[1].

''لواط کے گناہ میں اکثر بادشاہ اور افسران، تاجر اور عوام، کاتب، فقہاء اور قاضی وغیرہ ملوث ہیں، سوائے ان کے جن پر اللہ کا خاص کرم ہو۔''

رہی سوزاک یا شرمگاہ میں انفیکشن کی بات، تو اس کا بھی کثرتِ جماع سے کوئی تعلق نہیں۔ جدید سائنس نے یہ بتایا ہے کہ ایسی بیماریاں جراثیموں کے منتقل ہونے سے لگتی ہیں۔ کبھی تو یہ جراثیم انجان لوگوں سے جنسی تعلق قائم کرنے سے منتقل ہوتے ہیں تو کبھی گندگی کے شرمگاہ پر لگنے سے وہاں پرورش پانے لگتے ہیں۔[2] لہٰذا ناجائز تعلقات سے پرہیز کے ساتھ ساتھ صفائی کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح گندے ہاتھوں سے استبراء کرنا بھی

---

1 ابن کثیر دمشقی، ''البدایہ والنہایہ''، جلد 9، صفحہ 174، دار الکتب العلمیہ، لبنان۔

2 ڈاکٹر مبین اختر، ''نوجوانوں کے خصوصی مسائل''، صفحہ 227، 2010ء۔

جراثیم کی منتقلی کاایک سبب ہو سکتا ہے لہذا شرمگاہ کو چھونے سے پہلے ہاتھ صابن سے دھو لینے چاہئیں۔ جو لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے یااضطراری حالت میں مشت زنی کریں انہیں بھی پہلے اپنے ہاتھ صابن سے دھو لینے چاہئیں۔ گندے ہاتھوں سے شرمگاہ کو چھونا درست نہیں۔ کپڑوں کو 60 ڈگری پر گرم پانی سے دھونے یا کڑی دھوپ میں سکھانے سے کپڑوں پر کسی وجہ سے لگنے والے جراثیم مر جاتے ہیں۔

خیر ملا صدرا کا اس معاملے میں جاہل ہونا سمجھ تو آتا ہے کہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا اور ان کے کشف والہام کے جھوٹے دعوؤں کی اس کے سوا کوئی حقیقت نہیں کہ ریاضتوں کی وجہ سے انہیں نفسیاتی عارضے لاحق ہو گئے ہوں۔ البتہ نسلی منافرت کا کوئی جواز نہیں بنتا کیوں کہ اسلام میں قبیلے کی بنیاد پر کسی کو برا یا اچھا سمجھنے کی واضح مذمت موجود ہے۔[1] جدید سائنس یہ جان چکی ہے کہ تمام انسانوں کا ڈی این اے ایک جیسا ہے اور اندر سے سب انسان ایک جیسے ہیں۔ جو فرق ہے وہ بہت معمولی ہے۔ صحیح تعلیم اور آزادی میسر ہو تو ہر قوم علم و ہنر میں آگے بڑھ سکتی ہے۔

نسلی منافرت ابنِ سینا (متوفی 1037ء) کے ہاں بھی ملتی ہے۔ فرماتے ہیں:

و إذ لا بد من ناس يخدمون الناس فيجب أن يكون أمثال هؤلاء يجبرون على خدمة أهل المدينة العادلة، و كذلك من كان من الناس بعيدا عن تلقي الفضيلة فهم عبيد بالطبع، مثل الترك و

---

[1] سورہ الحجرات، آیت 13

الزنج، و بالجملة الذين نشأوا في غير الأقاليم الشريفة التي أكثر أحوالها أن ينشأ فيها أمم حسنة الأمزجة صحيحة القرائح و العقول[1].

ترجمہ: ''ضروری ہے کہ انسانوں میں سے کچھ دوسروں کے نوکر بنے رہیں۔ پس عدل پر استوار شہر میں ایسے لوگوں کو شہریوں کی خدمت پر مجبور کیا جاناواجب ہے۔اسی طرح وہ لوگ جو کسی فضیلت کو درک کرنے کے قابل نہیں اور طبیعی طور پر غلام ہیں، جیسے ترک اور سیاہ پوست افراد، اور وہ لوگ جو اشرفیہ کے علاقوں، جن میں اچھے آداب اور سالم ذہن والے طبقے کی تربیت ہوتی ہے، میں نہیں رہتے ان کو بھی اس کام پر مجبور کیا جائے۔ ''

خیر یہ حضرات تو اب دنیا سے جا چکے اور انہوں نے اپنے زمانے میں جو مناسب سمجھا کیا۔ اب اکیسویں صدی میں بعض مدارس میں ان حضرات کے جاہلانہ خیالات کو القابات میں لپیٹ کر معصوم بچوں کے اذہان میں راسخ کرنا ایسا مذاق ہے کہ یہ لوگ اگر زندہ ہو جائیں تو حیران ہوں گے کہ اس زمانے میں بھی کچھ ایسے حافظ تیار ہو رہے ہیں جو ہماری لفاظی میں الجھے ہوئے ہیں اور اس میں سے علم نچوڑنا چاہتے ہیں۔

---

[1] ابنِ سینا، ''الہیات شفا''، صفحہ 453، کتاب خانہ مرعشی نجفی، قم۔

12. مسلم فلسفہ کی بوسیدگی: ملا ہادی سبزواری اور کیمرے کا واقعہ

مسلم فلسفہ سے مراد وہ یونانی نظریات ہیں جو اموی دور میں عربی زبان کے رواج کے بعد یونانی اور ہندوستانی لکھاریوں کی تحریروں کے عربی تراجم ہونے کے نتیجے میں تقریباً ایک ہزار سال تک مسلم دنیا پر چھائے رہے۔ اس دوران کئی کتابیں لکھی گئیں مگر انکی علمی وقعت کچھ زیادہ نہ تھی۔ ان میں جو عقلی اصول بنائے گئے ان میں بہت سی خامیاں تھیں اور وہ زیادہ تر یونانیوں کی بنائی گئی فکری چار دیواری میں ہی محدود رہے تھے۔

البتہ قرون وسطیٰ کے صرف چند ایک مسلمان علما نے کچھ علمی نظریات بھی بیان کئے اور انکے تراجم مغربی زبانوں میں ہوئے تو مغرب کو بھی ان سے بہت فائدہ ہوا۔ اس کی ایک مثال خواجہ نصیر الدین طوسی (متوفی 1274ء) کی بطلیموس کی فلکیات پر تنقید اور اسکی اصلاح ہے کہ جس سے کوپرنیکس کو مدد ملی اور بعد میں اسکے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے گیلیلیو اور نیوٹن نے بطلیموسی فلکیات کو زمین بوس کر دیا۔ خواجہ طوسی نے اپنی کتاب الفصول فی الاصول میں بھی یونانی فلسفیوں کے اندھے مقلدین پر تنقید کی ہے۔

ادھر گیلیلیو کے ایرانی معاصر ملا صدرا (متوفی 1642ء) نے رہی سہی کسر نکال کر مسلم فلسفے کا بیڑہ غرق کر دیا۔ وہ موصوف فلوطین (متوفی 270ء) کی کتاب اثولوجیا سے بہت متاثر تھے۔ اصالت وجود کی الٹی عینک پہن کر یہ فلسفہ اپنیشاد اور ابنِ عربی کے تصوف کے

ساتھ ضم ہو گیا اور خارجی حقائق کے بارے پیش گوئی کے قابل نہ رہا۔ یوں علم کی اس بنیادی ترین صفت سے محروم ہو کر جہلِ مرکب بن گیا۔

علم کھلے ذہن کا تقاضا کرتا ہے

بد قسمتی سے عباسی دور میں قدیم یونانی کتب کے تراجم کرنے کے بعد مسلم فلسفیوں نے دنیا پر اپنی آنکھ بند کر لی اور دماغ کو تالا لگا دیا۔ جب تک آپ دنیا پر اپنے دروازے کھولے رکھتے ہیں اور مخالف کو سننے اور اس کی بات پر غور کرنے کی جرات کرتے رہتے ہیں، صرف اسی وقت تک آپ حقائق کو ٹھیک سے سمجھنے کے قابل رہتے ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں کی کتب کو اہل مغرب نے اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا لیکن جب مغرب میں علمی ترقی تیز ہوئی تو مسلمانوں نے انکی کتابوں کا بروقت ترجمہ نہ کیا۔ جو تھوڑے بہت تراجم ہوئے وہ بھی چھاپہ خانہ نہ ہونے کی وجہ سے مقبول نہ ہو سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ تفضل حسین کشمیری (متوفی 1801ء) نے نیوٹن کی کتاب کا جو عربی میں ترجمہ کیا وہ منظر عام پر نہ آ سکا۔ مسلم دنیا نے یونانی زنجیروں سے نجات تب پانا شروع کی جب انگریزوں نے ہندوستان کی فتح کے بعد یہاں جدید تحقیقات کو متعارف کرایا۔

جدید دور میں قدیم فلسفے کے ماہرین

موجودہ دور میں قدیم فلسفے کے ماہرین بہت کم ہیں۔ جدید دور میں کسی ایسے شخص کو قدیم نظریات کا ماہر نہیں کہا جا سکتا جو ذہنی طور پر اس جدید دور میں نہ رہتا ہو۔ کسی ایسے شخص کو

ملا صدرا کے خیالات کا ماہر قرار دینا درست نہیں جو جدید علوم کی روشنی میں ان کو نہ پرکھ سکے۔ جو ملا صدرا کے نظریات کے ناکارہ ہونے کی وجوہات کی نشاندہی نہ کر سکے، اس پر دیانتداری سے علمی تنقید کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اور اسکی بنیادوں کے کھوکھلے پن کو نہ سمجھ سکے۔ جدید دور میں علامہ طباطبائی، مرتضٰی مطہری، جوادی آملی، حسن زادہ آملی، جلال الدین آشتیانی وغیرہ بھی مسلم فلسفے کے مروج ہوئے ہیں۔ انہیں صرف ملا صدرا کا قصیدہ گو یا اسکی نقل کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب لوگ زمانۂ طالب علمی میں سکول کالج کا منہ نہ دیکھ سکے۔ یہ سب اپنے مریدوں کے لیے مقدس شخصیات ہیں، جن کے جذبات کا احترام ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی جان لینا چاہیے کہ تعلیم کی کمی محض داڑھی سفید ہونے سے دور نہیں ہو سکتی۔

ان حضرات کو ملا صدرا کے فلسفے کا ماہر نہیں کہنا چاہیے۔ کھنڈرات کو اندھیرے میں دیکھنے والا ان سے کچھ آشنائی تو پیدا کر سکتا ہے مگر ان کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتا۔ جیسے کھنڈرات کو ٹھیک سے سمجھنے کے لیے تیز روشنی کا استعمال بہت ضروری ہے، اسی طرح ملا صدرا کے بوسیدہ نظریات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جدید علوم کا بلب جلانا بہت ضروری ہے، جو ان حضرات کے پاس نہیں ہے۔ بد قسمتی سے آج کل منبروں اور سوشل میڈیا پر ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو انہی حضرات کے بوسیدہ خیالات کو اردو اور انگریزی میں ملمع کاری کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ بعض حضرات نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر اور پروفیسر بھی لکھ رکھا ہے۔

ملاہادی سبز واری کا واقعہ

مسلم فلسفے کی علمی دنیا سے لا تعلقی کا ایک بہترین نمونہ ملا ہادی سبز واری (متوفی 1873ء) ہیں۔ سال 1866ء میں ایرانی بادشاہ ناصر الدین شاہ قاجار مشہد کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جون میں وہ سبز وار سے گذر رہے تھے تو ملا ہادی سبز واری سے ملنے انکے گھر گئے جو اس وقت معقولات میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ شاہ کے ساتھ آقا رضا عکاس نامی ایک فوٹو گرافر بھی تھے جنھوں نے کیمرے سے ملاہادی سبز واری کی اکلوتی تصویر بنائی۔ اس دوران ملاہادی سبز واری نے جو رد عمل ظاہر کیا وہ اپنے اندر کئی صدیوں کا المیہ سموئے ہوئے ہے۔ اس واقعے کی روداد ادیب الممالک نے یوں بیان کی ہے:

فارسی متن: روز دوشنبه ۲۹ محرم، فیلسوف بزرگ که پیش از شرفیاب شدن آقا رضا عکاس باشی به خانه اش از عکاسی چیزی نشنیده و ندیده بود، پرسید: ماهیت عکس چیست؟ توضیح دادند که سایه ای است از شخص یا چیزی که بر روی کاغذی می افتد و باقی می ماند. حکیم سبز واری منکر هر گونه امکان پذیری عکس برداری شد و گفت آنچه شما می گویید منطقاً و عقلاً محال است، زیرا ما آنچه که در فلسفه خوانده‌ایم و می دانیم وجود ظِلّ قائم به وجود ذی ظِلّ است. پس از اصرار حاضران حکیم رو به روی دوربین عکاس باشی نشست. پس از ظاهر شدن عکسش نظرش نیز درباره عکاسی تغییر کرد[1].

[1] https://shahraranews.ir/fa/news/76743

ترجمہ: ''29 محرم، بروز سوموار۔۔۔وہ عظیم فلسفی کہ جس نے آقا رضا عکاس کے آنے سے پہلے فوٹو گرافی کے بارے میں نہ کچھ سنا تھا اور نہ دیکھا تھا، پوچھا: فوٹو کی ماہیت کیا ہے؟ انہوں نے وضاحت کی کہ یہ کسی شخص یا کسی چیز کا سایہ ہے جو ایک خاص کاغذ پر پڑتا ہے اور باقی رہتا ہے۔ حکیم سبز واری نے فوٹو گرافی کے امکان سے انکار کیا اور کہا کہ آپ جو کہتے ہیں وہ منطقی اور عقلی طور پر محال ہے۔ کیونکہ ہم نے فلسفہ میں جو پڑھا ہے اور جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ سایہ کا وجود، صاحبِ سایہ کے وجود سے قائم ہے۔ حاضرین کے اصرار پر حکیم سبز واری عکاس کے کیمرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ اپنی فوٹو سامنے آنے کے بعد فوٹو گرافی کے بارے میں ان کی سوچ بدلی۔''

تبصرہ

ملا ہادی سبز واری کا کیمرے کے بارے میں سوال کرنا اور اس کی ماہیت کو سمجھنے میں دلچسپی ظاہر کرنا ایک اچھی بات ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ وہ اس دور میں مسلم دنیا میں معقولات کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انکا قدیم فلسفے کی دلدل میں پھنسا ہونا افسوس ناک ہے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ملا ہادی سبز واری عرض اور جوہر جیسے مفاہیم سے ماہیت کو سمجھتے تھے، جو درست نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صورت، جو کہ عرض ہے، جوہر سے جدا نہیں ہو سکتی، جو کہ ماہیت کی اصل ہے۔ اب یہ جوہر و عرض وغیرہ کی اصطلاحات متروک ہو چکی ہیں۔ آجکل جدید اور دقیق تر اصطلاحات خارجی حقائق کا زیادہ بہتر احاطہ کرتی ہیں۔ اگر کہیں قدیم الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو ان سے قدیم معنی مراد نہیں لیے

جاتے۔ اسکی مثال طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب جیسی اصطلاحیں ہیں جن سے اب ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے۔ اگرچہ دوسرے ممالک میں بھی جہلاء کی کمی نہیں، مگر افسوس ہے کہ مسلم فلسفے کے نام پر پھر سے یونانی خرافات سوشل میڈیا پر عام کی جارہی ہیں۔ ان نامعقولات کو بدیہیات کا نام دے کر انکو دین کا حصہ بنادیا گیاہے۔ جدید علوم سے ان نام نہاد حکیموں کا اب بھی اتنا ہی تعلق ہے جتنا ملاہادی سبز واری کا تھا۔

آخر میں ملاہادی سبز واری کے فوٹو گرافی کو مان لینے سے بھی یہ مراد نہیں کہ انہوں نے روشنی کی ترکیب اور ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور جدید علوم کو سیکھنے کی کوشش کی۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اس کالے ڈبے کو ایک مفید آلے کے طور پر قبول کرلیا اور پرانے تصورات کے ساتھ اسکا ٹانکا لگالیا۔ اسکی ایک مثال نیوٹن کے قوانین کے بارے میں علامہ طباطبائی کی توضیحات ہیں جو ان کی کتاب ''اصولِ فلسفہ'' میں آئی ہیں۔ یہ لوگ ایسے مسائل میں غلط تفہیم کے ذریعے خود کو قانع کرکے دماغ کی کھڑکیاں بند کرلیتے ہیں۔

آیۃ اللہ العظمیٰ اسحاق فیاض مسلم فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جہاں تک اس فلسفے کی طبیعیات (فزکس) کا تعلق ہے تو وہ ساقط ہوچکی ہے اور اس کی ہوا اکھڑ چکی ہے۔ اب سائنس کا علم بالکل بدل کر اپنی بلندی کو چھو رہاہے۔ دوسری طرف ملاصدرا کے فلسفے کی فزکس صرف اوہام اور تخیلات کا مجموعہ ہے اور اسکی کوئی علمی وقعت نہیں۔[1]''

---

[1] https://ebnearabi.com/ur/307

13. مُلا صدرا کی فکر پر فلوطین کا سایہ

ایران کی دانشگاہ باقر العلوم کے استاد ڈاکٹر محمد مہدی گرجیان کے مقالے ''انعکاسِ فلسفۂ فلوطین در حکمتِ صدر المتألہین''[1] میں مُلا صدرا کے فلسفے پر فلوطین کے خیالات کے گہرے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ چند جاہلانہ توہمات ہیں جو جدید علوم میں رَد ہو چکی ہیں اور ان کا رٹا لگا کر خود کو عقلمند سمجھنا درست نہیں ہے۔

فلوطین کا زندگی نامہ

فلوطین یا Plotinus ، مصر میں سن 205ء میں پیدا ہوا۔ اسے نو فلاطونی مکتبِ فکر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ فلسفہ جو اس نے اپنے استاد آمونیس ساکاس سے سیکھا اور شاگرد کو سکھایا، نو فلاطونی فلسفہ کہلایا۔ نو فلاطونی فلسفی عقل کے ساتھ ساتھ شہود، جذب اور وجد کو حکمت کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی جداگانہ نو فلاطونی مشرب کی وجہ سے بعض اسے ایک الٰہیات دان قرار دینے کے بجائے ایک صوفی مفکر سمجھتے ہیں۔ اس کے مطابق فلسفے کا راستہ اندرونی شہود اور خالص مفاہیم پر مبنی جدلیاتی طرزِ فکر کے ساتھ ساتھ روح کو پاک صاف کرنے سے طے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک فلسفے کا معنی اور مقصد ہستی اور کائنات کو

---

[1] محمد مہدی گرجیان، نرجس رود گر، ''انعکاسِ فلسفۂ فلوطین در حکمتِ صدر المتألہین''، حکمت اسراء، بہار 1391 شمارہ 11۔

جاننا نہیں بلکہ معرفت اور تزکیہ کی مدد سے روح کو خدا تک پہنچانا ہے۔ وہ واضح انداز میں صوفیوں کی روحانی واردات کو حقیقی فلسفی کے فضل و کمال کی انتہاء سمجھتا ہے اور تعقل کو فلسفے کا مقصد نہیں سمجھتا۔[1]

فلسفۂ فلوطین کی تاثیر اور تاثرات

محققین نے فلوطین کو ان معنوں میں التقاطی حکماء میں شمار کیا ہے کہ اس نے افلاطون، ارسطو، رواقیوں اور عرفاء کے نظریات کو اپنی آراء میں جمع کر دیا ہے۔[2] پچھلوں کا اثر قبول کرنے کے علاوہ اس نے اپنے بعد والوں پر گہرے اثرات بھی مرتب کیے، اور مسیحی فلسفہ اور مسلم فلسفہ، ہر دو فلوطین کے عرفانی نظریات اور فلسفی قواعد پر قائم ہوئے۔ مسلم فلسفے کے تینوں مکاتب، مشائی، اشراقی اور حکمتِ متعالیہ اپنے اپنے انداز میں فلوطین کے دستر خوان کے ٹکڑوں پر پلے ہیں۔

مسلمانوں کا فلوطین کی سوچ سے متعارف ہونے کا آغاز ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے زمانے میں یونانی فلسفے کے عربی ترجمے کے دوران ہوا۔ اس تعارف کی تاریخ میں قابلِ توجہ واقعہ وہ غلط فہمی ہے جو فلوطین کی کتاب اثولوجیا کے بارے میں پیدا ہوئی۔ یہ کتاب

---

1 کاپلستون، ''تاریخ فلسفۂ غرب''، ج 1، ص 543، فارسی ترجمہ: سید جلال الدین مینوی، انتشارات سروش، تہران، 1367 شمسی۔

2 محمد علی فروغی، ''سیر حکمت در اروپا''، ص 72، نشر البرز، تہران، 1377 شمسی۔

معرفۃالربوبیہ، الٰہیات اور فلسفۂ اولیٰ کے عنوانات سے ترجمہ ہوئی اور اسے ارسطو کی کتاب پرپورفائری (متوفی 305ء) کی شرح سمجھا گیا۔ یہ پہلی بار مسیحی مترجم عبدالمسیح ابنِ ناعمہ نے یعقوب الکندی کے لیے سریانی سے عربی زبان میں ترجمہ کر کے ارسطو سے منسوب کی۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اثولوجیا فلوطین کی کتاب تاسوعات کا تیسرا حصہ ہے۔[1] ابنِ سینا نے ارسطو اور فلوطین کی آراء کو ملانے کی کوشش کی، کیونکہ وہ اثولوجیا کو ارسطو کی کتاب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس کی الہیات اور نظریۂ فیض پر اس کوشش کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔[2] شیخ اشراق نے بھی اس سے الہام لیا ہے۔

مُلا صدرا اثولوجیا کے مصنف کو عارفِ الٰہی، بلند معنوی مقامات پر پہنچا ہوا اور کشف و شہود اور علمِ حضوری سے بہرہ مند سمجھتا ہے۔[3] ملا صدرا اپنے کئی خیالات کو اثولوجیا سے ماخوذ قرار دیتا ہے۔ مثلاً: تجلی اور فیض و ظہور کا نظریہ کہ جس کے مطابق ممکنات حق کی تجلی کے آئینے ہیں اور حق ظہورِ واحد رکھتا ہے جو کہ واجب الوجود کا تعینات کے قالب میں نزول ہونا

---

[1] غلام رضا رحمانی، ''فلسفۂ فلوطین''، ص46، بوستان کتاب، قم، 1390شمسی۔

[2] سیرِ حکمت در اروپا، ص73

[3] ملا صدرا، ''اسفار اربعہ''، ج1، صفحہ 6؛ ج9، صفحات 109 تا 111، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

ہے،[1] حرکتِ جوہری،[2] عالمِ عقل کی صفات اور عالمِ اعلیٰ کا زندہ اور تام ہونا،[3] اتحادِ عقل و عاقل و معقول،[4] رابطۂ صَنم و مُثل،[5] ہر شے کی صفات کا عقل میں پایا جانا،[6] قاعدۂ بسیط الحقیقۃ کل الاشیاء،[7] دنیا کا ہیولا اور صورت سے ترکیب پانا،[8] قاعدۂ امکانِ اشرف،[9] قاعدۂ امکانِ اخس،[10] قاعدۂ الواحد لا یصدر منہ الا الواحد،[11] واحد سے چیزوں کا صادر ہونا،[12] وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] اسفار اربعہ، ج2، ص357

[2] اسفار اربعہ، ج3، ص111

[3] اسفار اربعہ، ج3، ص340

[4] اسفار اربعہ، ج3، ص427

[5] اسفار اربعہ، ج6، ص277

[6] اسفار اربعہ، ج6، ص281

[7] اسفار اربعہ، ج7، ص33

[8] اسفار اربعہ، ج7، ص147

[9] اسفار اربعہ، ج7، ص244

[10] اسفار اربعہ، ج7، ص258

[11] اسفار اربعہ، ج7، ص273

[12] اسفار اربعہ، ج6، ص278؛ ج7، ص272

فلوطین کے ہاں وجود کا کلی تصور

فلوطین وجود کے مراتب کا قائل ہے۔ وجود کی تشکیک اور اس کے مراتب کی بات افلاطون کے کائنات کو دو حصوں، معقول دنیا اور محسوس دنیا، میں تقسیم کرنے کا تسلسل ہے جس کو فلوطین نے مزید تقسیم سے دوچار کیا ہے۔ فلوطین عالمِ معقول اور عالمِ محسوس کے بیچ روح نام کے ایک واسطے کا قائل ہوا اور پھر اس نے روح اور مادے کے بیچ طبیعت نام کے ایک اور مرتبے کو تصور کیا۔ اس نے عالمِ محسوس میں بھی تشکیک کا مفروضہ پیش کیا اور وہ یوں کہ صورتوں کو مادے سے بالاتر مرتبہ قرار دیا۔

عقل، نفس، طبیعت اور مادہ کے علاوہ فلوطین واحد کا بھی قائل ہے جو وجود سے بالاتر ہے۔ لہٰذا اسے مراتبِ وجود میں شمار نہیں کرتا، بلکہ فوقِ وجود سمجھتا ہے۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ فلوطین کے فلسفی نظام کی بنیاد پانچ تصورات ہیں: واحد، عقل، روح، طبیعت اور مادہ۔ [1]

وہ واحد، عقل اور نفس کو اقانیمِ ثلاثہ قرار دیتا ہے۔ اقنوم، کہ جسے کبھی جوہر اور کبھی اصل کہتا ہے، ایسا جوہر ہے کہ اپنی خصوصیات کا ذاتی طور پر مالک ہے۔ ہر اقنوم کی صفات ذاتی اور لا یعلل ہیں اور ان کے بارے چون و چرا کرنا ممنوع ہے۔ عالمِ محسوسات اصل اور اقنوم نہیں ہے، اگرچہ وہ مراتبِ وجود میں سے ہے لیکن حقیقی وجود نہیں بلکہ ظاہری وجود ہے۔

---

[1] Encyclopedia of Philosophy, p. 457

وحدت الوجود اور اقانیم میں رابطے کا مسئلہ

فلوطین کے ہاں اقانیم کی تثلیث اور مراتبِ وجود میں جو کثرت ہے وہ کثرتِ محض نہیں بلکہ ایک گونہ وحدت ان سب پر مسلط ہے۔اس وحدت کا راز اقانیم کے درمیان تعلق میں پوشیدہ ہے۔ اس تعلق میں پہلی بات مسئلہ ء فیض ہے۔ واحد سرچشمۂ فیض ہے جس سے عقل کا اقنوم پیدا ہوتا ہے۔اس سے وجود، حیات، علم اور کثرتِ معقولات کا ظہور ہوتا ہے۔ عقل سے روح کا اقنوم جنم لیتا ہے۔ عالمِ محسوس روحِ کلی کا ایک پرتو ہے اور جزئی ارواح اس کے وجود کے پرتو ہیں۔ پس واحد سے جتنا دور ہوں وحدت کم اور کثرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔[1]

فلوطین کی فکر میں اتحادِ اقانیم کا مسئلہ اور فیض و مستفیض کے آپس میں جدا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی حقیقت بھی ہونا، وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ہر قسم کے نظریۂ وحدت الوجود کی بنیاد ہے۔ کئی محققین فلوطین کو وحدت الوجود کا ماننے والا سمجھتے ہیں، ان معنوں میں کہ وہ حقیقت کو واحد سمجھتا ہے اور واحدیت کو ہستی کا اصل اور منشاء سمجھتا ہے اور سب موجودات کو مبداءِ اول کا فیضان سمجھتا ہے اور وجود

---

[1] نصر اللہ پور جوادی، ''درآمدی بر فلسفۂ فلوطین''، ص14، انجمن فلسفہ ایران، تہران، 1357ش۔

کاہدف اسی مبداء کی طرف پلٹ جاناقرار دیتاہے۔اس بناپر سب موجودات حقیقتِ واحد کا پرتوہیں اور قوسِ نزول وصعود میں وہی انکامبداء بھی ہے اور غایت بھی ہے۔[1]

اقنومِ دوم، یعنی عقل، کے معاملے میں فلوطین افلاطون کے نظریۂ مُثُل سے بہت متاثر ہے۔وہ یہ سمجھتاہے کہ ہر موجود، چاہے نظر آسکے یانہ آسکے،ایک اور دنیابنام عالمِ معقول میں ایک اصلی صورت اور حقیقت رکھتا ہے۔ جہانِ محسوس کے سبھی موجودات اس دوسری دنیامیں آئیڈیاز یامعقول کے ذرات کی شکل میں وجود رکھتے ہیں۔ عقلِ کلی واحد سے بلاواسطہ پیدا ہوااور وہ معقولات کی صورتوں اور مُثُل کے پائے جانے کی جگہ ہے کہ جو اس کے ساتھ متحد ہیں اور حقیقت میں عقلِ کلی کی خود شناسی میں شامل ہیں۔ عقل احد کی تصویر ہے۔ وہ وجود کا پہلا مرحلہ، بلکہ خودِ وجود ہے۔ عقل کی حقیقت وجود کے سوا کچھ نہیں۔عالمِ معقول میں کوئی حجاب اور ظلمت نہیں ہے۔ معقول کی دنیامیں ہر موجودا گرچہ خاص ہے، لیکن کلِ موجودات بھی ہے۔[2]

اقنومِ سوم، یعنی روح، کو عالمِ بالاسے تعلق رکھنے والاامرِ مجرد سمجھتاہے جو جسمانی ڈھانچے سے تعلق جوڑنے سے قبل وجود رکھتی تھی۔ پھر وہ اس عالم کی طرف آئی۔ وہ روح کو بسیط سمجھتاہے اور اس کے مطابق روح نا قابلِ تقسیم ہونے اور مادے سے تجرد کی وجہ سے

---

1 سیرِ حکمت درار وپا، ص67

2 فلوطین، ''اثولوجیا''، صفحات 282، 665، 761، مترجم عربی: ابن ناعمہ حمصی، مترجم و شارح فارسی: حسن ملک شاہی، انتشارات سروش، تہران، 1378 شمسی۔

دوسری اشیاء کا اثر قبول نہیں کرتی۔ وہ روح کو مسافر سمجھتا ہے جو اپنے مبداء سے جدا ہو چکی ہے اور ایک الگ دنیا میں آ کر پست ترین مقام پر پھنس چکی ہے اور اب اسے اس راستے پر واپس جانا ہے۔ چونکہ وجود کے مراتب باہم پیوست ہیں، اسلیے روح کا واپس جانا ممکن ہے۔ فلوطین کے مطابق تینوں اقنوم، واحد، عقل اور روح، خارج کے علاوہ انسان کے اندر بھی موجود ہیں لیکن اکثر انسان ان سے آگاہ نہیں ہیں۔ یہ چیز روح کے عالم بالا کی طرف پرواز کرنے اور واحد میں ضم ہو جانے کو ممکن بناتی ہے۔

سیر و سلوک کا پہلا مرحلہ جسم کے تسلط سے رہائی ہے۔ دوسرے مرحلے میں فلسفہ سیکھ کر روح کو عالمِ معقول میں پہنچانا ہے۔ تیسرے مرحلے میں روح عقل سے آگے جا کر شہود تک پہنچ جاتی ہے۔ چوتھا سفر واحد سے وصال ہے۔ یہ وجد اور بے خودی کی حالت ہے۔ روح یہاں خود نہیں رہتی، فنا ہو کر خدا ہو جاتی ہے۔ فلوطین روح کے معدوم ہونے کو محال سمجھتا ہے اور بری ارواح کے تناسخ کا قائل ہے۔ جو تزکیہ نہ کریں وہ بدن کی موت کے بعد جانور اور حشرات بن جاتے ہیں۔

فلوطین کے نزدیک مادہ واحد سے صادر ہونے والی آخری چیز ہے۔ البتہ چونکہ یہ کائنات کے سب سے نچلے مرتبے کو تشکیل دیتا ہے، اسے ظلمتِ محض نہیں کہا جا سکتا۔ مادہ محض صلاحیت (قوہ) ہے۔ مادہ شر کی جڑ ہے۔ فلوطین عالمِ مادہ کو حادث نہیں، بلکہ قدیم سمجھتا ہے۔

14. علامہ اقبال کا افلاطون پر تبرّا

ملا صدرا کی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے صوفیوں کے گرو افلاطون پر علامہ اقبال کی تنقید کو پڑھ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملا صدرا کا اصالتِ وجود کا تصور افلاطون کے اصالتِ اعیان کا ہی تسلسل ہے، جو کہ چھپا ہوا سفسطہ ہے۔ اقبال اسرارِ خودی میں افلاطون پر کڑی گرفت کرتے ہیں۔ جسٹس شیخ عبدالرحمٰن نے ترجمانِ اسرار کے عنوان سے اسرارِ خودی کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہاں اقبال کے فارسی اشعار ان کے منظوم اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔

علامہ اقبال کے اشعار

در معنی اینکہ افلاطونِ یونانی کہ تصوف و ادبیاتِ اقوامِ اسلامیہ از افکار او اثر عظیم پذیرفتہ بر مسلکِ گوسفندی رفتہ است و از تخیلاتِ او احتراز واجب است

ترجمہ: اس بات کی وضاحت کہ یونانی مفکر افلاطون، جس کے افکار کا تصوف اور مسلم ادب پر گہرا اثر پڑا ہے، بھیڑ بکریوں کے مسلک پر تھا اور اس کے خیالات سے بچنا ضروری ہے۔

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم

از گروہ گوسفندان قدیم

ترجمہ: وہ افلاطون، وہ دیرینہ راہب، فلسفی پہلا

ہے دنیا کے پرانے گوسفندوں میں شمار اس کا

رخش او در ظلمت معقول گم

در کہستان وجود افکندہ سم

ترجمہ: ہوا رہوار اسکا فلسفہ کی ظلمتوں میں گم

نہ کوہستانِ ہستی میں جمے اس کے کہیں پر سُم

آنچنان افسون نا محسوس خورد

اعتبار از دست و چشم و گوش برد

ترجمہ: کیا یوں سر پہ نا محسوس کا جادو سوار اس نے

کہ چھینا ہاتھ، کان اور آنکھ سے سب اعتبار اس نے

گفت سر زندگی در مردن است

شمع را صد جلوہ از افسردن است

ترجمہ: کہااس نے کہ رازِ زندگی مرنے میں پنہاں ہے

جو گل ہو شمع، حاصل اس کو سو جلووں کا ساماں ہے

بر تخیلہای ما فرمان رواست

جام او خواب آور و گیتی رباست

ترجمہ: تخیل پر ہمارے حکمراں ہے آب وتاب اس کی

سلا کر دور کر دیتی ہے دنیا سے شراب اس کی

گوسفندی در لباس آدم است

حکم او بر جانِ صوفی محکم است

ترجمہ: نہیں تھا آدمی کے بھیس میں اک بھیڑ سے بڑھ کر

مسلط ہیں مگر افکار اس کے قلبِ صوفی پر

عقل خود را بر سر گردون رساند

عالم اسباب را افسانہ خواند

ترجمہ: لگا کر عقل کے پر وہ فلک پر اڑتا رہتا تھا

مگر اس عالمِ اسباب کو افسانہ کہتا تھا

کاراو تحلیل اجزای حیات

قطع شاخ سرو رعنای حیات

ترجمہ: تباہی اسکی حکمت سے ہوئی ہستی کے اجزاء کی

قلم کی شاخ اس نے زندگی کے سروِ رعنا کی

فکرِ افلاطون زیان را سود گفت

حکمت او بود را نابود گفت

ترجمہ: دکھایا فکر نے اس کی زیاں کو سود کی صورت

دی اس کے فلسفہ نے بود کو نابود کی صورت

فطرتش خوابید و خوابی آفرید

چشم ہوش او سرابی آفرید

ترجمہ: ہوئی خوابیدہ فطرت اس کی، خواب اک ہو گیا پیدا

جو کھولی چشم ہوش اس نے، سراب اک ہو گیا پیدا

بسکہ از ذوق عمل محروم بود

جان او وارفتہ ی معدوم بود

ترجمہ: رہی ناآشنا ذوقِ عمل سے اس کی کجرائی

بنا وہ بے حقیقت شے کا جان و دل سے شیدائی

منکر ہنگامہ ی موجود گشت

خالق اعیان نامشہود گشت

ترجمہ: بتایا واہمہ تخئیل کا موجود کو اس نے

حقیقت بخش دی اعیانِ نامشہود کو اس نے

زندہ جان را عالم امکان خوش است

مردہ دل را عالم اعیان خوش است

ترجمہ: جو زندہ دل ہیں، ان کو عالمِ امکان ہی اچھا ہے

جو مردہ دل ہیں ان کو عالم اعیان ہی اچھا ہے

آہوش بی بہرہ از لطف خرام

لذت رفتار بر کبکش حرام

ترجمہ: خرامِ ناز کی اس کے غزالوں میں نہیں قدرت

حرام اس کے چکوروں پر ہوئی رفتار کی لذت

شبنمش از طاقت رم بی نصیب

طایرش راسینہ از دم بی نصیب

ترجمہ: کہیں ہے رم کی طاقت اسکی شبنم کے نصیبے میں

وہ طائر اس کا ہے، باقی نہیں دم جس کے سینے میں

ذوق روئیدن ندارد دانہ اش

از طپیدن بی خبر پروانہ اش

ترجمہ: جسے کچھ ذوق اگنے کا نہیں وہ دانہ ہے اس کا

تڑپنے کے مزے سے بے خبر پروانہ ہے اس کا

راہب ما چارہ غیر از رم نداشت

طاقت غوغای این عالم نداشت

ترجمہ: جہاں کے شور و غوغا سے سراسیمہ ہوا ایسا

سوائے بھاگ جانے کے نہ اس راہب کو کچھ سوجھا

دل بسوز شعلہ ی افسردہ بست

نقش آن دنیای افیون خوردہ بست

ترجمہ: ہوا افسردہ شعلے سے حرارت کا تمنائی

اسے افیون کی پروردہ اک دنیا پسند آئی

از نشیمن سوی گردون پر گشود

باز سوی آشیان نامد فرود

ترجمہ: نشیمن سے اڑا بے باک ہو کر آسمان تک وہ

مگر پھر لوٹ کر آیا نہ ہر گز آشیاں تک وہ

در خم گردون خیال او گم است

من ندانم درد یا خشت خم است

ترجمہ: خمِ گردوں میں جا کر ہو گیا فکر اس کا آخر گم

نہیں معلوم کیا کہیئے، وہ تلچھٹ ہے کہ خشتِ خم

قومہا از سکر او مسموم گشت

خفت و از ذوق عمل محروم گشت

ترجمہ: ہوئیں مسموم اس کی فکر سے اقوام عالم کی

عمل کا ذوق کھو بیٹھیں، ہوئیں نیندوں کی وہ ماتی!

علامہ اقبال کا حاشیہ

"منکر ہنگامہ ی موجود گشت" پر حاشیہ لگاتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں :

"اس شعر میں افلاطون کے مشہور مسئلہٴ اعیان کی طرف اشارہ ہے، جس پر ارسطو نے نہایت عمدہ تنقید کی ہے۔ افسوس ہے کہ اس مسئلے کی توضیح اس جگہ ناممکن ہے۔ فارابی نے

الجمع بین الرائین میں ارسطو اور افلاطون کو ہم خیال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے نزدیک ناکام رہی ہے۔ ملاہادی سبزواری نے، جو حال کے ایرانی حکماء میں سے ہیں، اپنی کتاب اسرار الحکم میں زیادہ تر افلاطون کا تتبع کیا ہے۔ عربی اور فارسی جاننے والے ناظرین ان کتب کی طرف توجہ کریں۔ انگریزی والوں کو فلسفۂ مغرب کی کسی انگریزی تاریخ سے ان مسائل کی حقیقت مختصر طور پر معلوم ہو جائیگی۔''

ملاصدرا اور افلاطون کا دفاع

ملاصدرا نے اپنی کتاب اسفار اربعہ میں متعدد مقامات پر افلاطون کا ذکر کیا ہے۔ جہاں ارسطو نے افلاطون پر تنقید کی وہاں ملاصدرا ارسطو کے خلاف حملہ بہ شخص

(ad hominem argument) کا مغالطہ استعمال کرتے ہوئے افلاطون کی حمایت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اصالتِ اعیان کے مسئلے پر فلوطین کی کتاب اثولوجیا سے افلاطون کا دفاع یوں کرتے ہیں:

و إما لشوب حبه للرئاسة اللازم عن معاشرة الخلق و خلطه الملوک و السلاطین و إلا فکتابه المعروف بأثولوجیا یشهد بأن مذهبه وافق مذهب أستاده فی باب وجود المثل العقلیة للأنواع و الصور المجردة النوریة القائمة بذواتها فی عالم الابداع[1] .

---

[1] ملاصدرا، اسفار اربعہ، جلد 2، صفحہ 64، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

ترجمہ: ''ارسطو اس مسلک کی تردید محض حبِ جاہ کی بنیاد پر کرتا تھا۔ اور عام لوگوں سے میل جول رکھنے، بادشاہوں اور سلاطین کی صحبتوں میں آنے جانے کے یہ لازمی نتائج ہیں۔ ورنہ ارسطو کی کتاب اثولوجیا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مذہب بھی اس باب میں وہی تھا جو اس کے استاد کا تھا۔ وہ بھی انواع کے لیے مثلِ عقلیہ اور ایسی مجرد نوری صورتوں کا قائل تھا، جن کا قیام بذاتِ خود عالمِ ابداع میں ہے۔[1] ''

عقل پر تقدیس کے پردے

ملاہادی سبزواری بھی ارسطو کے مخالف تھے۔ لیکن ملاصدرا کی اس عبارت کو ارسطو کی شان میں گستاخی سمجھتے ہیں اور حاشیے میں غلو پر مبنی فضائل لکھتے ہوئے اسے نبی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حبِ جاہ وغیرہ ارسطو سے بعید ہیں:

ہذا بعید عن ساحة المعلم الأول الذی أنوار العلوم الحقیقیة منتشرة فی العالم به و بأمثاله من العلماء باللہ و الحکماء الأفاضل و بکدہم و بجہدہم و قد ورد فیه أنه کان نبیا جهله أہل زمانه و الذی خالطه من الملوک کأسکندر کان من الملوک الأفاضل أولی الرئاستین[2] .

---

[1] فلسفۂ ملاصدرا، ترجمہ اسفار اربعہ، صفحہ 341، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

[2] ملاصدرا، اسفار اربعہ، جلد 2، صفحہ 64، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

جہاں تک نبوت کا تعلق ہے تو فلوطین، جس کی کتاب اثولوجیا کو یہ ارسطو کی کتاب سمجھتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو سو سال بعد مصر میں پیدا ہوا اور ان پر ایمان نہیں لایا تھا۔ یہ زمانۂ فترت کا فرد ہے، اسے کس بنیاد پر نبی کہا جا سکتا ہے؟ مسلم فلاسفہ کے ہاں متقدمین کو نبی اور متاخرین کو امام بنانے کی روایت درست نہیں۔ یہ اندھی عقیدت ہے جو عقل کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ یہی بیماری یونانیوں کی تقلیدِ محض کا سبب بنی اور مسلمان فلسفی جدید علوم کو نہ اپنا سکے۔ مسلم معاشروں میں ایسے توہمات کے مارے افراد کو معقولات کا ماہر کہنا بجائے خود ایک المیہ ہے۔ چنانچہ کئی صدیوں سے مسلم معاشروں میں اَن پڑھ لوگوں میں عقلِ سلیم (common sense) نام نہاد علمائے معقول سے زیادہ ہے۔

صحیفۂ سجادیہؑ میں عالمِ مثال کے تصور کارد

صحیفۂ سجادیہؑ میں افلاطون کے تصور کے برعکس یہ آیا ہے کہ :

أَنْتَ اَللَّه لاَ إِلَه إِلاَّ أَنْتَ، اَلَّذِي أَنْشَأْتَ اَلْأَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ سِنْخٍ، وَ صَوَّرْتَ مَا صَوَّرْتَ مِنْ غَيْرِ مِثَالٍ، وَ اِبْتَدَعْتَ اَلْمُبْتَدَعَاتِ بِلاَ اِحْتِذَاءٍ○

ترجمہ: ''تو ہی وہ اللہ ہے کہ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ جس نے بغیر مواد کے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور بغیر کسی نمونہ و مثال کے صورتوں کی نقش آرائی کی اور بغیر کسی کی پیروی کئے موجودات کو خلعتِ وجود بخشا۔[1]''

[1] صحیفۂ سجادیہ کاملہ، دعائے یوم عرفہ، مترجم: مفتی جعفر حسین، صفحہ 350، امامیہ پبلیکیشنز پاکستان، 1998ء۔

15. سونے کا زرد رنگ اور ملا صدرا کی حرکتِ جوہری کا بطلان

سونے کا زرد ہونا وقت اور حرکت کی حقیقت کے بارے میں آئن سٹائن کے بیان کردہ کلی علم کے لاکھوں مصادیق میں سے ایک ہے۔ اگر آئن سٹائن کا نظریۂ نسبیت صحیح نہ ہوتا تو سونے اور چاندی کے رنگ میں فرق نہ ہوتا، اگرچہ کثافت الگ ہوتی جسے آج بھی ارشمیدس صاحب (متوفی 212 قبلِ مسیح) کے اصول کو استعمال کر کے ماپا جاتا ہے۔

علوم کا بچپن فلسفہ کہلاتا ہے۔ علم جب پختہ اور دقیق ہوتا ہے تو وہ فلسفے سے نکل کر حقیقت سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اب جبکہ علم کا دور ہے تو اکثر علوم فلسفے کے بچپنے سے نکل چکے ہیں لیکن ان کے موضوعات پر باقاعدہ تحقیق کا آغاز یونانی فلاسفہ نے ہی کیا تھا۔ چنانچہ فلسفہ پڑھنے والوں کو جدید علم سے آگاہ رہنا ضروری ہے تاکہ وہ حقائق کی دنیا سے کٹ نہ جائیں۔ قدیم فلاسفہ کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات میں اکثر باتیں غلط ثابت ہو چکی ہیں، ان کو تاریخ کے ایک باب یا ادب کے طور پر دیکھنے میں حرج نہیں لیکن ان میں الجھ کر گم نہیں ہونا چاہئیے۔ اگر کوئی شخص آج کے دور میں بھی ان بچگانہ غلط فہمیوں کو علم سمجھے تو یہ بد قسمتی کی بات ہو گی، اور ممکن ہے کہ اسے جہلِ مرکب میں مبتلا کر کے متکبر بنا دے۔

فلاسفہ دو ہزار سال تک حرکت کے بارے میں پریشان رہے۔ وہ حرکت کی دو اقسام بیان کرتے تھے: مکانی حرکت اور عرضی حرکت۔ مکانی حرکت کا مطلب کسی چیز کا ایک جگہ

سے دوسری جگہ منتقل ہونااور عرضی حرکت سے مراد ایک ہی جگہ پڑی چیز کے اعراض میں تبدیلی آنا، جیسے درخت کی ٹہنی پر لٹکے ہوئے سیب کا کچھ مہینوں میں سبز سے سرخ ہو جانا، لیا جاتا تھا۔ وہ وقت کو مطلق اور قدیم سمجھتے تھے، ایسا خیال جو جدید شواہد کی روشنی میں باطل ثابت ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ارد گرد کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنا ماضی بعید میں مشکل تھا لہٰذا وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ اشیاء کے اعراض میں حرکت اصل میں ان کے اجزاء کی مکانی حرکت ہے۔ اس کائنات میں حرکت ایک ہی قسم کی ہے اور وہ ہے مکانی حرکت، یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا، اور یہ مادے اور توانائی کے تعامل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ توانائی کی ایک قسم حرکی توانائی ہے، جب کوئی دوسری توانائی اس قسم میں تبدیل ہوتی ہے تو مادے میں مکانی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ گاڑی کے انجن میں پٹرول کی کیمیائی توانائی گاڑی کی حرکی توانائی اور حرارت میں بدلتی ہے۔ اس طرح فاقدِ حرکت پٹرول معطئ حرکت بن جاتا ہے۔

چیزیں مالیکیولز سے مل کر بنی ہیں اور وہ ایٹموں میں ایک خاص ترتیب کے ظہور کا نام ہیں۔ ایٹم جب سے وجود میں آئے ہیں، ایسے ہی ہیں اور کھربوں سالوں سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ صرف تابکار ایٹموں میں بعض اوقات نہایت مختصر وقت میں تبدیلی آتی ہے جب ان کا کچھ حصہ جدا ہو کر ان کی تابکاری ختم کرتا ہے۔ ایٹموں کی 118 اقسام دریافت ہو چکی ہیں جنہیں عناصر کہا جاتا ہے۔ ان کی مختلف تراتیب اور زاویوں سے جڑ کر بننے والے مالیکیولز کی اقسام کروڑوں میں ہیں۔ درخت پر لگا ہوا کچا اور کھٹا سیب جب دھوپ میں پکنے

کے عمل سے گزرتا ہے تو اس کے مالیکیولز کی ترکیب بدل جاتی ہے، مالیکیولز کے ایٹموں کی مکانی حرکت سے وہ سرخ اور میٹھا ہوتا ہے۔

پرانے زمانے میں نفسیات کے معالج نہیں ہوتے تھے نہ نفسیاتی امراض کا شعور اور مریضوں کے حقوق کا کوئی تصور، لہذا ذہنی مسائل کے شکار افراد کو ان کی زندگی میں اذیتیں پہنچائی جاتیں لیکن اگر وہ کچھ ثقیل تحریریں لکھ جاتے تو وفات کے بعد ان کی غلط فہمیوں کو بھی فلسفہ سمجھا جاتا۔ ایسے ہی ایک بزرگ ملا صدرا شیرازی (متوفی 1640ء) بھی تھے، جیسا کہ ان کے مکاشفات سے ظاہر ہے۔ انہوں نے حرکت کے بارے میں فلاسفہ کی بحثوں سے پریشان ہو کر یہ خیال پیش کیا کہ سب چیزیں اپنی اصل میں حرکت ہیں، اور اس کا نام انہوں نے رکھا حرکت جوہری، یعنی اشیاء کا باطن حرکت ہے۔ ان کے مفروضے میں کوئی دقیق پیش گوئی کرنے کی صلاحیت نہیں ہے جسے آزما کر اسکی تائید یا تردید کی جا سکے۔ یہ ایک ادیبانہ یا شاعرانہ خیال سے زیادہ کچھ نہ تھا اور اس کی وجہ وقت کے بارے میں ان کے ذہن میں پایا جانے والا الجھاؤ تھا۔ اب جبکہ زمان و مکان کا مشاہدہ کرنے والے کی نسبت سے متاثر ہونا ثابت ہو چکا ہے تو یہ تصور حقیقت کے ساتھ ذرا بھی سازگار نہیں ہے۔ نیز یہ کوئی مشخص پیش گوئی کرنے، عقلی سوالات کا سامنا کرنے اور دقیق معلومات دینے سے قاصر ہیں۔

وقت کا احساس ہمارے ذہن میں تب پیدا ہوتا ہے جب ہم اپنے سامنے تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتے دیکھتے ہیں۔ ماضی میں بھی لوگ درختوں کو بڑا ہوتے، انسانوں کو ضعیف ہوتے،

سورج کے طلوع و غروب ہوتے، پانی میں لہروں کے پیدا ہوتے اور ختم ہوتے، شیر کو شکار کرتے دیکھتے تھے۔ آپس میں تبدیلیوں کے بارے میں بات کرنے کے لیے وقت کا مفہوم ایجاد ہوا۔ انہیں فصلیں بونے، تہوار منانے، عبادت کرنے اور مختلف سماجی فیصلے کرنے کے لیے وقت کی پیمائش کرنا پڑی تو اسے اپنے ماحول میں پائی جانے والی ایک ایسی تبدیلی سے جوڑا جو نسبتاً یکساں تھی، یعنی سورج کی حرکت کی مناسبت سے سال، مہینے اور دن گنے جانے لگے۔ یہ سورج کا وقت نہ تھا، بلکہ سورج کی حرکت کو وقت کی پیمائش کا ایک درست ذریعہ سمجھا گیا تھا۔ اب گھڑیوں کی صورت میں دقیق تر پیمانے بنا لیے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ وقت اور تبدیلی لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ دادی اماں کی سونے کی انگوٹھی اگر ہزاروں سال بھی پڑی رہے تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

زمان و مکان مشاہدہ کرنے والوں کے مشاہدے سے تعلق رکھتے ہیں (اور دماغ کے کیمیائی تعاملات فوٹانز کے انجذاب و تخلیق سے انجام پاتے ہیں)، لہذا مشاہدہ کرنے والے کی حرکت ان کی پیمائش کو متاثر کرتی ہے۔ زمانہ قبل از مسیح سے ہی زمان کی طرح مکان کی پیمائش کے پیمانے بھی بنا لیے گئے تھے اور اقلیدس صاحب کی جیومیٹری کی مدد سے نقشے بنائے جا رہے تھے اور جائیداد وغیرہ کا حساب کتاب لگایا جا رہا تھا۔ جناب بطلیموس نے اختر شناسی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ مسلمان سائنس دانوں نے یونانی فلاسفہ کے کام کو آگے بڑھایا اور عظیم عالم خواجہ نصیر الدین طوسی (متوفی 1274ء) نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں طوسی کپل (Tusi Couple) کی مدد سے بطلیموس کے جدول میں مزید بہتری پیدا

کی۔ جناب شمس الدین خفری (متوفی 1550ء) نے اپنی کتاب ''حل ما لاینحل'' میں بطلیموسی نظریۂ کائنات پر خواجہ طوسی کے کام کو مزید آگے بڑھایا، یہ آخری قابل ذکر شیعہ سائنس دان ہیں۔[1]

سنہ 1571ء میں ملا صدرا کی پیدائش تک جدول بن چکے تھے اور کیلنڈر استعمال ہو رہے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فلسفے کی تعلیم کے دوران یہ کام دیکھا مگر صحیح طرح سے سمجھ نہ سکے اور بجائے اس کے کہ وقت کی مناسبت سے حرکت کی فہم حاصل کرتے، ہر چیز کو علیحدہ اور مخصوص وقت کی حامل قرار دیا کہ گویا وقت اشیاء کی صفت ہے۔ اس سے ان کا ذہن منتشر ہو گیا، نہ حرکت سمجھ آئی نہ ہی وقت۔ اسی وجہ سے وہ حرکت کے بارے میں انسانی علمی سرمایے میں کوئی اضافہ کرنے سے قاصر رہے۔ کسی چیز کے حجم کو اس کا جداگانہ مکان اور کسی مظہر کے الگ دورانیے کو اس کا جداگانہ زمان نہیں کہا جا سکتا۔ مختلف جانوروں کی رفتار میں فرق کی وجہ ان کی حرکی توانائی میں فرق ہوتا ہے، جس کا سبب ان کی جداگانہ عضلاتی ساخت ہے نہ یہ کہ ان کا وقت جداگانہ ہو۔ توانائی کا صحیح فہم نیوٹن (متوفی 1727ء) کے کام سے حاصل ہوا۔ ایسے زمانے میں جب کاغذ نایاب اور تعلیم ایک خاص طبقے تک محدود تھی، ملا صدرا نے چالیس کے قریب کتابیں لکھ کر اپنے ابہام کو خوب پھیلایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے امام غزالی (متوفی 1111ء) کے بعد اہل سنت میں

---

[1] جارج صلیبا، ''اسلامی سائنس اور یورپی نشاۃ ثانیہ کی تشکیل''، صفحہ 275، مشعل بکس، لاہور (2019ء)۔

سائنسی کام کے لیے درکار افرادی قوت بہت کم ہو کر تصوف عام ہو گیا، ایسے ہی ملا صدرا کے بعد اہل تشیع میں سائنس دان پیدا ہونا کم ہو گئے اور سوائے برصغیر کے علامہ تفضل حسین کشمیری (متوفی 1801ء) کے، شیعہ علمی مراکز سے کوئی سائنس دان پیدا نہ ہو سکا، اور صوفی بزرگوں کی تعداد بڑھی۔ یاد رہے خواجہ طوسی کا زمانہ منگولوں کی تاراجی کے بعد ظاہری زوال کا زمانہ ہے جبکہ ملا صدرا شاہ عباس صفوی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں جو سیاسی اور معاشی وسائل کے اعتبار سے عروج کا زمانہ تھا اور اگر خواجہ طوسی کی روایت پر کام آگے بڑھتا رہتا اور سائنس کی کتابوں کے بروقت تراجم ہوتے تو مسلم دنیا سائنسی زوال سے بچ سکتی تھی۔ امام غزالی اور ملا صدرا کا تصوف اور کج فکری کو رواج دینا چنگیز اور ہلاکو کی لائی گئی وقتی تباہی سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔

حرکت کی سمجھ میں بڑی پیشرفت ملا صدرا (متوفی 1640ء) کے معاصرین، فرانس کے ڈیکارٹ (متوفی 1650ء)، اٹلی کے گلیلیو (متوفی 1642ء) اور جرمنی کے کیپلر (متوفی 1630ء) کے کام سے ہوئی۔ ڈیکارٹ نے مکان کو بیان کرنے کے لیے کارتیسی نظام (Cartesian coordinate system) وضع کیا اور یوں اقلیدس (متوفی 300 قبل مسیح) کی جیومیٹری (ہندسہ) کو شکلوں سے بیان کرنے کے طریقے کو چھوڑ کر مساواتوں کی شکل میں بیان کرنے کا طریقہ ایجاد ہوا۔ گلیلیو نے جہاں پہلی بار آسمان کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربین کا استعمال کر کے زحل کے چاند دریافت کئے اور دوسرے بڑے کام کئے، وہیں یہ بھی بتایا کہ حرکت نسبی ہے، یعنی اس کی پیمائش مشاہدہ کرنے والے

کی حرکت سے متاثر ہوتی ہے۔ کیپلر نے سیاروں کی حرکت کے اصول دریافت کئے۔ اگر ملا صدرا کے وقت کے بارے میں پیدا کئے گئے مغالطے کی رو سے دیکھا جائے تو حرکت کی نسبیت کا سوال پیدا نہیں ہو گا کیوں کہ وہ ہر چیز کے اپنے جداگانہ وقت کے قائل ہو گئے تھے، گویا ناک سے مکھی اڑاتے اڑاتے ناک ہی توڑ بیٹھے تھے۔ حرکت کی فہم میں انقلاب نیوٹن (متوفی 1727ء) کی تحقیق سے آیا، جس کی بنیاد کارتیسی نظام پر تھی۔ انہوں نے حرکت کی مساواتیں اور قوانین پیش کئے۔ آج سائنس پڑھنے والے بچے میٹرک میں جو مساواتیں آسانی سے استعمال کر لیتے ہیں وہ ملا صدرا وغیرہ کو معلوم نہ تھیں۔

آج آسانی سے میسر اس علم کی قدر کرنی چاہئیے جو ہمارے محترم بزرگوں کی قسمت میں نہ تھا۔ نیوٹن اور ان کے ہم عصر سائنسدانوں کے کام کی بدولت حرکت کا علم فلسفیانہ بچپنے سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ چکا تھا۔ لفظی جملہ بندی کے بجائے ریاضیاتی زبان میں تیزی سے پیشرفت کر رہا تھا۔ نیوٹن نے ایک اور تحفہ کالکولس کی ریاضی (عربی: حسبان) کی ایجاد کی صورت میں دیا کہ جس پر آج ٹیکنالوجی استوار ہے۔ اس ریاضی کی مدد سے نیوٹن کی مساواتوں کو استعمال کر کے انجن بنالیا گیا۔ توپوں کے کام کو سمجھ کر ان میں بہتری لائی گئی۔ بندوق ایجاد ہوئی۔ پانی کی حرکیات سمجھ کر بحری جہازوں کی تعمیر میں بہتری آئی۔ کپڑا بننے کے لیے کارخانے لگے۔ سفر کے لیے ریل گاڑی بنالی گئی۔ بڑی عمارات کی تعمیر میں ان کے اجزا کے وزن اور مضبوطی کا دقیق حساب لگا کر بہتری پیدا کی جانے لگی۔ راکٹ بنا کر خلا تک رسائی ممکن ہوئی۔ یہ حقیقی علم تھا کہ جس نے سائنس دانوں کو عالم ہستی میں تصرف کی

طاقت دی اور انہوں نے لاکھوں ایجادات کر کے دنیا بدل دی (لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ[الرحمٰن: 33])۔اٹھارویں اور انیسویں صدی میں برقی چارج، مقناطیس اور روشنی کے ریاضیاتی قوانین دریافت ہوئے۔ ان انکشافات کو ملا ہادی سبزواری (متوفی 1873ء) کے ہم عصر جیمز میکسویل (متوفی 1879ء) صاحب نے اپنی معروف مساواتوں کی شکل میں جمع کیا کہ جن سے روشنی کی رفتار کا فارمولا معلوم ہوا۔

یہاں رک کر اس بات سے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ ملا صدرا کے اوہام کی دلدل ایسی تھی کہ اگرچہ علامہ تفضل حسین کشمیری (متوفی 1801ء) نیوٹن کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر چکے تھے لیکن مدارس میں ان کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے افرادی قوت میسر نہ ہوئی، الٹا ملا ہادی سبزواری کی شکل میں ملا صدرا کے ناولوں کے سب سے بڑے شارح پیدا ہو گئے۔

روشنی کی رفتار کے فارمولے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ رفتار لامتناہی نہیں۔ دوسرا یہ کہ روشنی کی حرکت کی پیمائش مشاہدہ کرنے والے کی حرکت کی نسبت سے متاثر نہیں ہوتی۔ جبکہ باقی چیزوں کا معاملہ ایسا نہ تھا۔ مثال کے طور پر اگر ایک بس سو کلو میٹر کی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہو اور اس سے ایک گیند دوسری بس میں پھینکی جائے جو نوے کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہو تو دوسری بس میں بیٹھے فرد کے جسم پر اس گیند کی ضرب کا اثر ایسے ہو گا جیسے گیند دس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے لگی ہو۔ لیکن روشنی کی رفتار پر اس کے منبع کی رفتار کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ اب حرکت کے علم میں ارتقاء کا وقت آن پہنچا تھا۔

عقلاء کے حلقوں میں اس استثنیٰ پر تحقیق ہونے لگی۔ 1905ء میں آئن سٹائن (متوفی 1955ء) نے گلیلیو کے حرکت کی نسبیت کے نظریئے میں بہتری پیدا کرتے ہوئے نئی مساواتیں تجویز کیں جن کی پیش گوئیاں جلد ہی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئیں۔ (دقت کیجئے، رد نہیں کیا، بہتری لائے)۔ انہوں نے زمان ومکان کا روشنی سے تعلق دریافت کر لیا۔

آئن سٹائن کے کام سے ہی مادے اور توانائی میں وحدت معلوم ہوئی۔ منکاؤسکی صاحب نے زمان کو مکان کی ایک جہت کے طور پر ماپنے کے لیے کارتیسی نظام میں چوتھی جہت کا اضافہ کر کے زمان ومکان کا ہندسی نظام تشکیل دیا۔ البتہ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، آئن سٹائن کے علاوہ بھی لوگ ان سوالوں پر کام کر رہے تھے اور لورنز اور پوینکرے اس انکشاف کے قریب پہنچ چکے تھے جو آئن سٹائن کی قسمت میں آیا اور وہ سبقت لے گئے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ علم کا تعلق چونکہ حقیقت سے ہوتا ہے لہذا نیا علم پچھلے کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے اور اس آگے بڑھنے کا مطلب پچھلے کام پر سہاگہ پھیرنا نہیں ہوتا، جیسا کہ بعض نادان افراد کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جہاں برصغیر میں امام احمد رضا خان بریلوی ''فوز مبین در ردِ حرکت'' زمین لکھ رہے تھے، سائنس ایٹم کی ساخت اور بنیادی ذرات کو سمجھنے میں کامیاب ہوئی جس سے کوانٹم فزکس نے جنم لیا اور اس علم نے کیمسٹری کے اصولوں کی ریاضیاتی بنیاد بھی فراہم کی۔ اسکی بنیاد نیوٹن کے نظریۂ حرکت پر تھی اور اسے نیوٹن کے ایجاد کردہ کالکولس کی مدد سے سمجھا گیا تھا۔ یہاں بھی یہ سمجھنا چاہئیے کہ یہ علم نیوٹن کی مساواتوں کو رد

نہیں کرتا بلکہ ایک نئے افق کا اضافہ یا تکملہ ہے۔ ہمارے سمارٹ فون، سولر پینل، جدید طبّی آلات اور کمپیوٹر وغیرہ اسی علم کا نتیجہ ہیں۔ جب اس علم کا اطلاق سونے کے ایٹم کو سمجھنے کے لیے کیا جائے تو سونے کے آخری مدار کا الیکٹران سنار کی دکان کے باہر کھڑے ہو کر مشاہدہ کرنے والے شخص کی نسبت سے بہت تیز رفتار ہے، کیونکہ سونے کا ایٹم چاندی سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی حرکت کو سمجھنے کے لیے گلیلیو کے بجائے آئن سٹائن کے تصحیح شدہ نظریۂ نسبیت کا استعمال کیا جائے تو d5 مدار سے فرمی سطح پر جانے کے لیے اسے جو دو اعشاریہ تین الیکٹران وولٹ کی توانائی چاہیئے وہ سفید روشنی پڑنے پر نیلے اور سبز طیف کے جذب ہونے اور باقی کے منعکس ہونے کا سبب بنتی ہے۔ اس وجہ سے ہمیں سونا زرد دکھائی دیتا ہے۔ چاندی کے الیکٹران کی حرکت پر نسبیت کا اثر بہت بڑا نہیں ہے لہذا وہ ساری سفید روشنی کو منعکس کر دیتی ہے۔ اس کی تفصیل سائنسی مجلات میں دیکھی جا سکتی ہے۔[1]

انیسویں صدی میں جناب ڈارون (متوفی 1882ء) نے اپنا معروف نظریۂ ارتقاء پیش کر کے بیالوجی کی دنیا میں ویسا ہی مقام حاصل کر لیا جو فزکس میں نیوٹن کو حاصل ہے۔ ڈی این اے کی دریافت کے بعد ہونے والی تحقیقات نے حیاتیاتی ارتقاء کا کوانٹم فزکس سے ربط دریافت کر لیا ہے۔ حرکتِ جوہری سے جڑا ایک اور جاہلانہ خیال جو ملا صدرا کی کتب میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پیدا ہونے سے پہلے جمادات، نباتات اور حیوانات کے مرحلے سے

[1] Pyykkö, Pekka; Desclaux, Jean Paul, "Relativity and the Periodic System of Elements". Accounts of Chemical Research. 12 (8): 276, (1979).

گزرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حمل ٹھہرنے کے لمحے سے ہی انسان کا ڈی این اے مکمل ہوتا ہے اور یک خلوی جنین بھی زندہ ہوتا ہے اور انسانی نوع سے تعلق رکھتا ہے۔ جس نطفے اور بیضے سے مل کر بنا ہوتا ہے وہ بھی زندہ ہوتے ہیں، جماد نہیں۔ جنین کی زندگی اپنے اجداد کی حیات کا تسلسل ہوتی ہے، کہ جیسے ایک چراغ سے اگلا چراغ جلایا جاتا ہے۔ جہاں تک ارتقاء کی بات ہے تو جانور اور پودے یک خلوی مرحلے سے ہی الگ ہو گئے تھے اور انکا ارتقاء جداگانہ ہوا ہے۔ اسکی تفصیلات انٹرنیٹ پر نباتی خلیے اور حیوانی خلیے میں فرق تلاش کر کے دیکھی جا سکتی ہیں۔ نیز ارتقاء میں جو تبدیلی ہے وہ عرضی حرکت، یعنی اجزاء کی مکانی حرکت، ہوتی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں جناب فرائیڈ کی تحقیقات کی بدولت علمِ نفسیات کی علمی بنیادیں قائم ہوئیں اور انہیں اس علم میں وہی مقام حاصل ہو گیا جو بیالوجی میں ڈارون اور فزکس میں نیوٹن کو حاصل ہے۔ آج دنیا بھر، بشمول ایران، میں نفسیاتی مسائل کا علاج سائنسی طریقوں سے ہی ہو رہا ہے۔ اس علم میں بھی ملا صدرا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اکیسویں صدی میں ملا صدرا کی کتابوں میں مسائل کا حل تلاش کرنا سادہ دلی ہے۔ بقول میر تقی میرؔ:۔

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ملا صدرا کا معروف ناول ''اسفارِ اربعہ'' دیو بندی مسلک کے عالم مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی 1956ء) نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اسے لاہور سے حق پبلی کیشنز نے ''فلسفہ ء ملا صدرا'' کے عنوان سے 2018ء میں ایک بار پھر شائع کر دیا ہے۔ کافی ضخیم ناول ہے اور ریاضی سے بالکل پاک ہے۔ جو لوگ اردو ترجمے میں حرکتِ جوہری کی بحث کو دیکھنا چاہیں تو وہ صفحات 636 سے 644 تک ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی قاری موصوف کے تخیلات کا مختصر تعارف حاصل کرنا چاہتا ہو تو طاہر اصغر زادہ صاحب کی کتاب کا مطالعہ کر لے جس کا اردو ترجمہ ''برہان سے عرفان تک'' کے عنوان سے کراچی سے سبیلِ سکینہ پبلشرز نے شائع کر دیا ہے۔ پڑھتے ہوئے ہنسنا منع ہے۔ پرانے لوگوں کے خیالات کی علمی حیثیت جدید شواہد کی روشنی میں متعین کرنی چاہیئے لیکن انکا شخصی احترام ان کے عہد کے مطابق کرنا چاہیئے۔ سچ یہ ہے کہ ملا صدرا عربی کے ایک ادیب ہیں جو اپنی جگہ ایک ہنر ہے، اگرچہ عقلی علوم کی دنیا میں وہ اپنے معاصرین کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ملا صدرا کی کتابوں میں قرآنی آیات و احادیث بطورِ ڈھال استعمال کی گئی ہیں، جیسے نجومی اپنی جنتریوں میں کرتے ہیں۔ بے شک ملا صدرا کو مقدس متن کی الگ تفسیر کا حق تھا لیکن جدید دور میں ان کے غیر علمی خیالات کی تبلیغ نوجوان نسل کا قیمتی وقت ضائع کرنا ہے (وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللہ بِغَيْرِ عِلْمٍ [لقمان:6])۔ چار صدیاں ضائع ہونے کے بعد جاگنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

16. ملا صدرا کے خیالات کی فرسودگی

ملا صدرا پر فلوطین کا گہرا اثر ہے۔ وہ حرکتِ جوہری کے مفروضے کو اثولوجیا سے ماخوذ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یونانی فلاسفہ کے استاد نے اپنی کتاب اثولوجیا، جس کے معنی حق شناسی کے ہیں، میں یہ لکھا ہے:

کسی قسم کا کوئی جرم (جسم) کیوں نہ ہو، مرکب ہو یا بسیط، وہ کسی طرح ثابت اور قائم نہیں رہ سکتا، اگر اس میں کوئی نفسانی (روحانی) قوت موجود نہ ہوگی اور یہ بات اس لیے ضروری ہے کہ اجرام کی طبیعت میں سیلانی کیفیت اور فناپذیری داخل ہے، پس اگر سارا عالم صرف جرم ہی جرم ہو اور اس میں کوئی نفس (روح) اور کسی قسم کی حیات و زندگی نہ ہو، تو تمام چیزیں برباد و تباہ ہلاک و درہم برہم ہو کر رہ جائیں گی۔

مذکورہ بالا عبارت میں تو اس کی بھی تصریح موجود ہے کہ جسمانی طبیعت اس شخص کے نزدیک بھی ایک سیال جوہر ہے، اور اس بات کی بھی صراحت ہے کہ تمام اجسام خود اپنی ذات کی حیثیت سے تباہ و برباد ہونے والے ہیں اور عقلی ارواح باقی رہتے ہیں جیسا کہ میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔"[1]

---

[1] فلسفۂ ملا صدرا، صفحہ 643، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

آخر میں جسمانیۃ الحدوث وروحانیۃ البقاء والا مفروضہ مراد ہے، ملا صدرا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی انہوں نے فلوطین سے کشید کیا ہے۔ سابقہ مضمون میں اس بات کی وضاحت ہوئی کہ سائنس کا نظریۂ نسبیت اور ملا صدرا کا حرکتِ جوہری کا تصور ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ نظریۂ نسبیت کے مطابق ہر چیز اپنی نسبت سے حالتِ سکون میں ہے، یعنی غیر متحرک ہے۔ باقی اشیاء کی حرکت مشاہدے کے مقام کے سکون کی نسبت سے سمجھی جاتی ہے۔ عرضی حرکت اجزاء کی مکانی حرکت ہوتی ہے، اور اجزاء اپنی نسبت سے غیر متحرک میں ہوتے ہیں۔ یہی بات نیوٹن کے پہلے قانونِ حرکت میں بھی بیان کی گئی ہے جس کے مطابق ہر وہ چیز جو ہماری نسبت سے حالتِ سکون میں ہے، ساکن رہے گی جب تک اس پر کوئی قوت عمل نہ کرے۔ اور ہر وہ چیز جو حرکت میں ہے، اس کی حرکت تبھی ختم یا تبدیل ہو گی جب اس پر کوئی قوت عمل کرے۔ چیزوں کو حرکت دینے کے لیے توانائی خرچ کرنا پڑتی ہے۔ نیوٹن نے دوسرے قانون حرکت میں اس قوت کو ماپنے کا طریقہ بتایا، جس کا پہلے قانون میں ذکر ہے۔ ہملٹن صاحب کی مساوات اصل میں نیوٹن کا دوسرا قانون حرکت ہی ہے، جو جدید طبعیات میں توانائی کے بیان کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اسکے بالکل برعکس ملا صدرا اشیاء کی اصل جوہر کو اور جوہر کو عینِ حرکت مانتے ہیں، کہ جسے حرکتِ جوہری (intrinsic mobility-or-substantial motion) کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان میں بجلی اور توانائی کا بحران کبھی نہ آتا۔ حقیقت وہی ہے جو نیوٹن نے بیان کی کہ حرکت پیدا کرنے یا اس کو ختم کرنے یا اس کی رفتار میں تبدیلی لانے کے لیے

باہر سے توانائی خرچ کرنا ضروری ہے جس کی مقدار معلوم کرنے کے لیے بھی نیوٹن نے ریاضی کی مساوات بنا کر دی۔ اسی پر جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا دار و مدار ہے۔ ملا صدرا کا حرکتِ جوہری کا تصور آغا وقار کی پانی سے چلنے والی کار کی طرح بے بنیاد ہے، جس نے ستمبر 2012ء میں پاکستانی میڈیا میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ ایسے جاہلانہ خیالات نیم خواندہ لوگوں کو مصروف رکھنے کے سوا کسی کام کے نہیں ہوتے۔

حرکت کا نظریۂ نسبیت جنابِ گلیلیو نے دریافت فرمایا تھا جس کی ریاضیاتی مساواتوں میں آئن سٹائن نے جزوی تصحیح کی۔ سابقہ مضمون میں یہ بھی معلوم ہوا کہ سونے کا رنگ اسی صورت میں زرد ہو سکتا ہے اگر اس کے نیوکلیئس اور مشاہدہ کرنے والے شخص کا وقت ایک ہو، اور وہ نسبتاً ساکن ہوں۔ ملا صدرا جوہر کی شدت و ضعف کے قائل ہیں، اور حرکت کو نیاز قرار دیتے ہیں، چنانچہ کمال یافتہ چیزوں کی حرکتِ جوہری سست تر ہو گی اور اس طرح جماد اور انسان کا وقت برابر نہیں ہو سکتا۔ حرکت کی نسبیت ان واضح مثالوں میں سے ہے جہاں ملا صدرا کے خیالات خارجی حقائق کے بالکل متضاد ہیں۔ البتہ حرکت کو نیاز اور سکون کو کمال سے تعبیر کرنا بھی ملا صدرا کی کج فہمی ہے۔ نیز نظریۂ نسبیت حرکتِ مطلق اور سکونِ مطلق کے تصور کو بھی رد کرتا ہے، اور آئن سٹائن کی تصحیح کے بعد تو زمان، مکان اور مادے کی مقدار بھی نسبی قرار پائے جہاں سے مادے اور توانائی کا تعلق معلوم ہوا کہ جو ایٹمی توانائی کی توجیہ کرتا ہے۔ گویا ملا صدرا کے تصورات کے تابوت میں آخری کیل آئن سٹائن نے ٹھونکی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ملا صدرا حرکت کی تعریف میں تعصب

(confirmation bias) کا شکار ہوئے ہیں، اور جیسا کہ صوفیاء کی روش ہے، انہوں نے پہلے سے طے شدہ نتیجے کے حصول کے لیے حرکت کی غلط تعریف وضع کی۔

سابقہ مضمون میں ہم نے یہ بھی جانا کہ حرکت کی متعدد اقسام نہیں کہ ان میں قدرِ مشترک تلاش کرنا پڑے اور یوں حرکتِ جوہری کا جواز نکالا جا سکے، بلکہ حرکت ایک ہی قسم کی ہے اور وہ حرکتِ مکانی ہے، چاہے کل کی ہو یا اجزاء کی، اور یہ مادے اور توانائی کے تعامل کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حرکت کی ہر تعریف خارجی حقائق کا مکمل احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ کم و کیف و وضع کی حرکت اصل میں اجزاء کی مکانی حرکت کا اظہار ہے۔ پرانے فلاسفہ کے ہاں مکان کو حجم اور زمان کو دورانئے کے طور پر سمجھنا بھی غلطی سے خالی نہ تھا۔ مکان کی درست فہم بھی ڈیکارٹ کے کارتیسی نظام میں حاصل ہوتی ہے۔ آئن سٹائن کے کام کے بعد منکاوسکی نے زمان کو کارتیسی نظام میں شامل کر کے منکاوسکی نظام ترتیب دیا ہے جو زمان و مکان کو ایک ساتھ سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اس مضمون میں ہم وجود کی اصالت کے مغالطے پر بات کریں گے۔ خارج میں موجود اشیاء پر جب قدیم فلاسفہ نے غور کیا تو کہا کہ اشیاء وجود اور ماہیت کا مرکب ہیں اور ماہیت اعراض اور جوہر کا مجموعہ ہے۔ اب جدید علم کی روشنی میں ہم جانتے ہیں کہ اشیاء مالیکیولز سے مل کر بنی ہیں جو ایٹموں کے مرکبات ہیں اور مخلوقات کی ماہیت مالیکیولز کا مرکب ہونا ہے اور اعراض ان مالیکیولز کا فعل ہوتے ہیں جو مادے اور توانائی کے تعامل کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اندھیرے میں اشیاء کا رنگ ختم ہو جاتا ہے اور درجۂ حرارت خاص حد تک بڑھ جائے تو

ٹھوس اشیاء مائع حالت میں آ جاتی ہیں۔ وجود اصل میں اشیاء کا کلی مفہوم ہوتا ہے جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور ماہیت سے ہٹ کر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جب اجزاء الگ ہو جائیں تو کل کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ ملا صدرا اس حقیقت کے بالکل الٹ چلے تھے اور اس مغالطے کا شکار ہوئے تھے کہ اصالت وجود کو حاصل ہے۔ بقول حسرت موہانی:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اصالتِ وجود (ontological primacy) کا مغالطہ تجربی اور نظری، دونوں میدانوں میں علم کا دروازہ بند کرتا ہے۔ اگر اعراض کو ماہیت کے بجائے وجود کا فعل سمجھا جائے تو ان کے بارے میں تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے کیوں کہ وجود تو ہمارے ذہن سے باہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا جس کے دوسری اشیاء سے تعامل کا کوئی بندوبست کر کے مظاہرِ فطرت کا مطالعہ کیا جا سکے۔ دوسری طرف ہمارا ذہن خارجی حقائق کو سمجھنے کے لیے بہت سے کلی مفاہیم پیدا کرتا ہے لیکن ان کو خارجی حقائق کا متبادل فرض کر لینا ان کلی مفاہیم کی اصلاح کا دروازہ بند کرنا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ملا صدرا کے تصورات پچھلے چار سو سال میں فطرت کے کسی ایک مظہر کے بارے میں کسی قسم کی قابلِ تصدیق معلومات فراہم کرنے یا کوئی دقیق پیش گوئی کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ملا صدرا اصل میں قدیم یونانی فلاسفہ میں سے ناکام ترین شخص افلاطون کی روایت کا احیاء کرنے والے فلوطونس

(متوفی 270ء) کے پیرو تھے جو ڈارک ایجز کے بانیوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ سابقہ مضمون میں بیان ہوا، ملا صدرا شیعی دنیا میں سائنسی تحقیق کا خاتمہ کر کے انہیں اوہام اور افسانہ طرازی کی کھائی میں دھکا دینے والی شخصیت ہیں۔

اب جوہر کی طرف آتے ہیں۔ قدیم فلاسفہ کے ہاں جس کو جوہر کہا جاتا تھا اس کا قیاس مالیکیولز کے مرکب پر درست نہیں ہے۔ وہ جوہر کو بسیط سمجھتے تھے لہٰذا جوہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اشیاء کی ماہیت اصل میں مالیکیولز کا مرکب اور اس کے ماحول میں موجود توانائی سے تعامل کے نتیجے میں صادر ہونے والے اعراض کا مجموعہ ہے۔ ایک مثال سے شاید بات واضح تر ہو جائے۔ جب ماں کے شکم میں حمل ٹھہرتا ہے تو وہ فقط باپ کے نطفے سے نہیں بنتا بلکہ جدید سائنس نے بتایا ہے کہ ماں کا بیضہ، جو اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ صرف خوردبین سے نظر آسکتا ہے، اس سے جب باپ کے نطفے کا ایک سپرم ملتا ہے تو ان کا مرکب یک خلوی بچہ (زائیگوٹ) بنتا ہے جو نو ماہ رحمِ مادر میں نشو و نما کر کے جنم لیتا ہے۔ بیضہ اور سپرم دونوں زندہ ہوتے ہیں اور انکی حیات ماں اور باپ کی حیات کا تسلسل ہوتی ہے۔ اگر جوہر حقیقت رکھتا تو ان دونوں کے جواہر بھی ہوتے اور ان سے ملنے والے زائیگوٹ کا جوہر ان دونوں جواہر کا مرکب ہوتا جس سے اس کا بسیط ہونا محال ہو جاتا۔ اگر جوہر کو مختلف قسم کے مالیکیولز کا مرکب مانا جائے تو پھر تو حرکتِ جوہری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

جدید سائنس نے یہ بھی بتایا ہے کہ جب مالیکیولز کو ملا کر کوئی شے بنتی ہے تو اسکی ایک کلی شناخت ہوتی ہے۔ لیکن جب مالیکیولز اس کل سے الگ ہوں تو وہ کوئی شناخت نہیں رکھتے۔ تفصیلی بحث کوانٹم فزکس کی کسی کتاب میں جسیمات متماثلہ

(quantum indistinguishable particles)

کے ابواب میں دیکھی جا سکتی ہے۔اس سے جسمِ عنصری کی تکرار کا مغالطہ بھی حل ہو جاتا ہے اور یوں معاد میں ملا صدرا کے جسمِ مثالی والے مفروضے کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ جب چھوٹے ذرات کسی بدن سے الگ ہوتے ہیں تو انکی کوئی شناخت نہیں ہوتی، انہیں کسی بدن سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی کل شناخت رکھتا ہے مگر مالیکیولز خود کوئی تشخص نہیں رکھتے۔

اب ایک نظر علمیات پر ڈالتے ہیں۔ ملا صدرا کا نظریۂ علم شیخ اشراق سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ وہ علمِ حصولی کے ساتھ ساتھ علمِ حضوری اور علمِ شہودی کے بھی قائل ہیں۔ علمِ حصولی سے مراد وہ علم ہے جو انسان اپنے دماغ کی مدد سے خارجی حقائق کا تجزیہ و تحلیل کر کے حاصل کرتا ہے۔ اس میں غلطی کا امکان بہت ہوتا ہے اسی لیے اس کے پیش گوئی کے قابل ہونے کا اثبات کرتے رہنا چاہئیے اور کلی قواعد میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئیے۔ علمِ حضوری اور علمِ شہودی محض وہم ہیں۔ ملا صدرا جس دور میں گزرے ہیں اس وقت سائیکالوجی اور نیورو سائنس میں کوئی پیشرفت نہیں ہو سکی تھی لیکن اب ہمیں یہ

بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں کہ جن چیزوں کو علمِ حصولی سے الگ سمجھا گیا وہ اصل میں علمِ حصولی میں شامل تھیں یا نفسیاتی گرہیں تھیں جو کثرت ریاضت کی وجہ سے کسی مرتاض کے ذہن کو لاحق ہو جاتی ہیں اور وہ خود کو بادشاہ یا عارف سمجھنے لگتا ہے۔

یہاں کچھ مصادیق پر مختصر تبصرہ کر کے امید کی جاتی ہے کہ قاری صوفیانہ علمیات کی باقی گتھیاں خود سلجھا لے گا۔ بدیہیات ہمیشہ صحیح نہیں ہوتیں۔ ایک ان پڑھ آدمی کے لیے یہ بات بدیہی ہے کہ زمین سورج سے بڑی ہے، لیکن سائنس نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے۔ اپنے ہونے کا احساس بچے میں پہلے دو سے تین سال میں اپنے جسم کا ناگزیر تجربہ کر کے پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کومے کی حالت میں پیدا ہوا اور وہ کئی سال بعد کومے سے باہر آ جائے تو وہ بھی چھوٹے بچوں کی طرح اپنے ہاتھ اور پاؤں وغیرہ کو غور سے دیکھے گا اور اسے بھی اپنی کلی تصویر بنانے میں بہت وقت لگے گا۔ رہی درد کے احساس کی بات تو وہ دماغ میں عصبی پیغام پہنچنے کے بعد پیدا ہونے والا ردِ عمل ہے۔ جدید سائنس نے اسے سمجھ کر درد کش ٹیکے ایجاد کئے ہیں جن کے استعمال سے ایسا ممکن ہوا ہے کہ جراحی کے عمل کو درد کے احساس کے بغیر مکمل کیا جا سکے۔ اس سے صوفیا کی یہ غلط فہمی دور ہوتی ہے کہ علمِ حضوری خطا سے پاک ہوتا ہے۔ گرمی کے احساس کو علمِ حضوری نہ سمجھنا بھی اس گروہ کا ایک کھلا تضاد ہے جبکہ درد اور گرمی، دونوں احساسات عصبی نظام ایک ہی طریقے سے دماغ تک پہنچاتا ہے، اور دونوں صورتوں میں خاص ادویات کے ذریعے انسان کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ علم تصویر کے بغیر ہی ہوتا ہے، دماغ میں برقی ترتیب کی شکل میں ہوتا ہے اور اس کا وسیلہ عصبی نظام ہی ہے اور

اس میں خطا کا امکان بھی ہوتا ہے۔ منطقی بدیہیات کو ہر بچہ بچپن کے ناگزیر تجربات سے سیکھتا ہے۔ بچے کو کسی گرم چیز کو چھو کر پتا چلتا ہے کہ وہ سرد نہ تھی۔ علت و معلول کا تعلق بھی تجربے سے سیکھتا ہے۔ جزو کے کل سے چھوٹا ہونے کا علم بھی کوئی لدنی علم نہیں، ان اصطلاحوں کی تعریف کا معاملہ ہے۔ بچہ پیدا ہونے سے ہی ہر جزو کو کل سے چھوٹا دیکھتا ہے۔ ہم چیزوں کے حصوں کو انکا جزو قرار دیتے ہیں تو ان کے چھوٹا ہونے کی بنیاد پر ہی قرار دیتے ہیں۔ بچے نے اجتماعِ نقیضین کا تجربہ نہ کرنے سے اس کو محال سمجھا۔ روزمرہ کے تجربے سے حاصل ہونے والی منطق کو خطاناپذیر سمجھنا بھی فاش غلطی ہو گی۔ اس کے بہت سے اصول ریاضی میں ٹوٹ جاتے ہیں جیسے لا متناہی سلسلے کا جمع ہونا یا کسی لا متناہی حد والے انٹگرل کا حل ہو کر ایک عدد کی شکل میں نتیجہ دینا کہ جو تسلسل کے امکان کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح جو چیزیں کوانٹم فزکس اور نظریۂ نسبیت نے بتائی ہیں ان کی توجیہ روزمرہ کے منطقی قاعدوں سے نہیں کی جاسکتی۔ علت و معلول کی ترتیب بھی کوانٹم فزکس کے بعض مظاہر میں الٹ جاتی ہے، نینو میٹر سے چھوٹی چیزوں میں وجود اور عدم باہم مدغم ہوتے ہیں۔ منطقی بدیہیات نسبی طور پر برحق ہیں لیکن مطلق سچائیاں نہیں۔ ریاضی کو بھی علمِ حضوری نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ایک قسم مہمل ریاضی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نیز یہ دماغ کا فعل ہے۔ اگر دماغ کو چوٹ آجائے تو بھول جاتی ہے۔ اگر برابر مشق نہ کی جائے تو بھول جاتی ہے۔ مادی کتاب پر مادی سیاہی سے لکھے ہندسوں اور مساواتوں کی تصویر کے بغیر ریاضی سیکھنا اور کرنا ناممکن ہے۔

صدرائی تصوف کی ایک اور غلط فہمی وقت کے قدیم ہونے کی ہے، جسے بگ بینگ کے انکشاف نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ جب ہم یہ دیکھیں کہ ایک طرف سائنس کے کلی اصول ہیں جن کی پیش گوئیوں کے مطابق دنیا میں نئی چیزیں بنائی گئی ہیں اور وہ کلی اصول مظاہرِ فطرت کی صحیح پیش گوئی اور باہمی طور پر ہم آہنگ تشریح کرنے کے قابل ہیں اور دوسری طرف ان کے بالکل متضاد ملا صدرا کے خیالات ہوں تو حق کس طرف ہے؟ اس کا فیصلہ اس بات کو سمجھنے سے ہو گا کہ خدا اپنی مخلوق سے مظاہر فطرت کے ذریعے سے جو کہہ رہا ہے وہ حق ہے، جیسا کہ قرآن میں بھی آفاق کی آیات کا ذکر آیا ہے (سورہ فصلت، آیہ 53)۔ سائنس کے اصولوں کی بنیاد پر ہی انسان خلا میں راکٹ بھیجنے اور ہزاروں میل دور سے ویڈیو کال کرنے جیسے فطری پابندیوں سے آزاد ہونے والے کارنامے انجام دے پایا ہے (سورہ الرحمٰن، آیہ 33)۔ نیز یہ کہ اگر علمِ حضوری وغیرہ کی شکل میں خطاناپذیر علم ہر انسان کی دسترس میں ہو تو اختلاف ختم ہو جائے۔

اصالتِ وجود کی غلط فہمی سے صدرائی بابے مراحلِ اخلاق اور مراحلِ سلوک کی توجیہ بھی بناتے ہیں۔ انسان علم مراحل میں حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کا تعلق ذہن میں معلومات کے ذخیرے کے بڑھنے سے ہے، لیکن اخلاق کا تعلق غرائز سے ہے جو جسم کے سبھی انفعالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ علمی مراحل کا اخلاقی مراحل پر قیاس درست نہیں۔ انسان مرکب ہے۔ علم کا لازمہ اخلاقی بلندی نہیں، نہ اخلاقی اعتبار سے اچھا ہونے کا لازمہ علمی پیشرفت ہے۔ جو علم انسان سیکھتا ہے وہ اس کا حصہ بن جاتا ہے، لیکن ماہیت کے ایک حصے

کو اس کا جوہرِ بسیط قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ انسانوں میں علم کی بنیاد پر درجات ہو سکتے ہیں لیکن اخلاق اور سیاسی معاملات میں سب برابر ہیں۔ اسی لیے جب قومی ریاست کا تصور ابھرا اور آئین کی شکل میں سماجی معاہدہ تشکیل پایا تو سب شہریوں کو سیاست میں برابر قرار دیا گیا۔

مراحل میں اخلاقی پیشرفت کا مغالطہ صوفی میں خود پسندی پیدا کرتا ہے، وہ جوں جوں نام نہاد سیر و سلوک میں آگے جاتا ہے توں توں متکبر ہوتا جاتا ہے۔ اگر وہ سیاست میں آئے تو خود کو معصوم نہ سہی، محفوظ ضرور سمجھ لیتا ہے اور دوسروں کو کمتر سمجھ کر اجتماعی فیصلوں میں اپنی دھونس چلانا چاہتا ہے۔ اسی لیے فاشزم کو سیاسی تصوف بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قم کے صوفیا، مصباح یزدی اور جوادی آملی وغیرہ، کے سیاسی تصورات نازی جرمنی کی سیاسی غلط فہمیوں کا عکس ہیں۔ افلاطون صاحب کہ جن کو بابائے تصوف بھی کہا جاتا ہے، نے بھی مدینۂ فاضلہ (utopia) کا خیال پیش کیا تھا جو ان کی زندگی میں ہی خارجی حقائق کے برعکس ثابت ہو گیا تھا جب ایک یونانی راجا 'دیانوسس' نے انہیں 'سیراکوس' کو ایسا مثالی شہر بنانے کا موقع دیا۔ ریاست کو یکساں روبوٹ بنانے کا کارخانہ سمجھنا بہت خطرناک تصور ہے جو اکثر نسل کشی کا سبب بنا ہے۔

ملا صدرا کے خیالات کو 1979ء کے ایرانی انقلاب کے بعد جدید علوم کے مقابلے میں زور و شور سے پیش کیا گیا لیکن وہ عملی طور پر بالکل بے کار ثابت ہوئے۔ ایران کے کسی صنعتی، معاشی، سیاسی، انتظامی یا ثقافتی مسئلے کی پیش گوئی کرنے اور ان کا حل دریافت کرنے میں یہ

خیالات ناکام رہے۔ ایران کے بنکوں میں اب بھی ربوی نظام ہے اور ایران کی یونیورسٹیوں میں آج بھی جدید علوم ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ اجتماعی مسائل کا حل کرنا تو دور کی بات فرد کی سطح پر بھی ایرانی نفسیاتی معالج فرائیڈ اور جدید ماہرین نفسیات کے وضع کردہ طریقہ علاج کی مدد سے ہی اپنے مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ البتہ قم میں سرکاری مولویوں کی ایسی کھیپ ضرور تیار ہو گئی ہے جو ملا صدرا کی پرانی عربی کی عبارتوں سے کھیلنے اور لفظی جدل کو علم سمجھتی ہے۔ چنانچہ اہل تشیع کے دوسرے بڑے مرجع آیت اللہ وحید خراسانی نے اس سرکاری تصوف بازی کو کشک، یعنی زبان کا چسکہ، قرار دیا ہے۔ گذشتہ چار سو سال میں صدرائی تصوف نے جہل مرکب اور توہم و تکبر کے سوا کچھ نہیں دیا۔

ان مضامین کا مقصد ملا صدرا کے بنیادی تصورات کے غیر علمی ہونے کی وضاحت کرنا تھا۔ ہم سب کے کئی تصورات غیر علمی ہو سکتے ہیں، اور ملا صدرا کے دور میں جب علم اتنا پھیلا نہیں تھا، ان کے تصورات کا غلط ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔ ان مضامین کا مقصد صرف علمی تنقید اور اتمامِ حجت ہے۔ آجکل غامدی صاحب صوفیا کو اسلام کے متوازی فرقہ کہہ کر ان کی تکفیر کر رہے ہیں۔ یہ ایک غلط روش ہے۔ ہمیں صوفیا کے مغالطوں کو سمجھنا اور حل کرنا چاہئے لیکن ان کے انسانی حقوق، عقیدے اور رائے کی آزادی کے حق کا احترام کرنا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکا مسلک ہم سے الگ ہے، لیکن ان کو اسلام سے خارج قرار دینا قتل جیسے سنگین جرائم کی بنیاد بن سکتا ہے۔ احادیث میں تکفیر کی مذمت آئی ہے۔

17. بدایۃالحکمہ کے ابتدائی مغالطے

علامہ محمد حسین طباطبائی کی کتاب بدایۃالحکمہ کو مُلا صدرا کے فلسفے کے تعارف کے طور پر پڑھایا جارہاہے۔ذیل میں اس کے ابتدائی مغالطوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

1۔ مفہومِ وجود کو بدیہی کہنا ابہام کا باعث ہے

علامہ اپنی کتاب کی ابتداء میں ہی وجود کے مفہوم کو بدیہی قرار دیتے ہیں۔ یوں وہ یہ بات قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ وجود سے جو چاہے مفہوم مراد لے لے۔جب کوئی آپکو یہ کہے کہ کوئی مفہوم بدیہی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات کی وضاحت اور اس کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا، بلکہ آگے چل کر اس ابہام سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ بدیہی باتیں اکثر درست نہیں ہوتیں۔ مثلاً یہ بالکل بدیہی ہے کہ زمین سورج سے بڑی ہے، مگر یہ درست نہیں ہے۔ سوچنا چاہیے کہ جو شخص وجود کی تعریف اور اسکی وضاحت نہیں کر سکتا وہ اس کے بارے میں نظریہ پردازی کیوں کر رہا ہے؟

2۔ وجود کا مفہوم مشترک لفظی ہے

اگلا مغالطہ وجود کے مفہوم کو مشترکِ معنوی (univocal) قرار دینا ہے۔ یہ بالکل درست بات نہیں ہے۔ سب چیزوں کا ہونا ایک معنوں میں نہیں ہوتا کیونکہ چیزوں کے وجود کی حقیقت الگ ہوتی ہے۔ مرزا غالب کے گھر میں برتنوں یا کبوتروں کا ہونا اور معنوں

میں ہے لیکن انکی شاعری میں مرثیے کا ہونا اور معنوں میں ہے۔ کسی دلیر انسان کے سینے میں شیر کا دل پایا جانا اور کسی شیر کے سینے میں شیر کا دل ہونا الگ الگ معنی رکھتا ہے۔ صورتحال اس وقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب کوانٹم ذرات کے وجود پر غور کیا جائے۔ وہاں وجود کا معنی بالکل وہ نہیں جو روزمرہ کی زندگی میں پائے جانے والے موجودات کے لیے ہے۔ الیکٹران کا ہونا مشاہدے سے متاثر ہوتا ہے، لیکن پتھر کے وجود پر مشاہدے کے وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ علامہ کو تو ان باتوں کی خبر نہ تھی لیکن جو لوگ جدید علوم سے آشنائی رکھتے ہوں، ان کو غور کرنا چاہیے۔ اسی طرح خدا کو اگر زمان و مکان سے ماوراء اور ناقابلِ رؤیت مانا جائے تو اسکا وجود بالکل بھی زمان و مکان میں مادی آثار رکھنے والے وجود کے ساتھ معنی کا اشتراک نہیں رکھتا۔ وجودات کی حقیقت مختلف ہو تو معنی بھی مختلف ہوتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ مفہومِ وجود مشترکِ لفظی (equivocal) ہے۔ وجود، موجود کی صفت ہے، جو حقیقت میں کسی کے موجود ہونے کا پتا دیتی ہے۔ وجود موجودات سے الگ خارجی وجود نہیں رکھتا۔ نیز خدا و خلق کی صفات کا معنی مختلف ہے۔ چنانچہ امام رضا علیہ السلام سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ خدا کا عالم ہونا اور مخلوق کا عالم ہونا صرف لفظی طور پر ایک جیسا ہے مگر انکا معنی الگ ہے:

وَإِنَّمَا سُمِّيَ اللهُ عَالِماً؛ لِإِنَّه لاَ يَجْهلُ شَيْئاً، فَقَدْ جَمَعَ الْخَالِقَ وَالْمَخْلُوقَ اسْمُ الْعَالِمِ وَاخْتَلَفَ الْمَعْنى[1]

ترجمہ: ''بے شک اللہ کا ایک نام عالم ہے کیوں کہ وہ کسی چیز سے جاہل نہیں، البتہ خالق اور مخلوق کے عالم ہونے میں صرف نام کا اشتراک ہے مگر معنی میں اختلاف ہے۔''

وجود تو باقی الفاظ کی طرح ایک لفظ ہے جو انسانوں کے بیچ تبادلۂ خیال کے لیے بنی ہوئی زبانوں میں شامل ہے۔ یہ کسی چیز کی ہونے یا نہ ہونے کے بارے معلومات کو بیان کرنے کے لئے زبان کا حصہ ہوتا ہے۔ جیسے کہ رنگ اور اس قسم کے دیگر الفاظ، کہ جن کا بتنگڑ بنانا حماقت ہے۔

3۔اصالت ماہیت کو حاصل ہے

آگے چل کر علامہ وجود کو ماہیت سے جدا قرار دیتے ہیں اور اسے اصل مانتے ہوئے ماہیت کو ذہنی اختراع قرار دیتے ہیں۔ کسی کا ہونا اسکی ماہیت کا حصہ ہوتا ہے، اس سے الگ نہیں ہوتا۔ فلاں چیز کیا ہے، اسی میں یہ سوال بھی آجاتا ہے کہ کیا وہ وجودِ خارجی رکھتی ہے؟ ہمارا علم ماہیت کے بارے ہوتا ہے، ماہیت کو جانے بِنا کسی کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ وجود کو ماہیت پر مقدم سمجھنا علم کا دروازہ بند کرنا ہے اور صدری خیالات کو علم کا

---

1 شیخ صدوق، کتاب التوحید، صفحہ 188، باب أسماء اللہ تعالی والفرق بین معانیها وبین معانی أسماء المخلوقین۔

جا گزین بنانا ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ علامہ طباطبائی کا نظریۂ علم بھی حقیقت کے منافی ہے۔

4۔ وجود میں وحدت اور تشکیک باطل ہے

ہم سبھی اپنے ارد گرد مختلف چیزوں کے وجود اور عدم کا احساس کرتے ہیں۔ بچہ شروع میں ہی کھلونے کے ہونے یا نہ ہونے، اور مختلف کھلونوں کے مختلف وجود سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودات مختلف ہیں۔ علامہ ایک تو وجود کی وحدت کے قائل ہیں، یعنی توحیدِ وجودی، پھر ماہیت کی اصالت کے بھی منکر ہیں۔ تو اب موجودات میں فرق کی توجیہ کیسے کریں؟ اس مخمصے سے نکلنے کے لیے انہوں نے مُلا صدرا کی طرح وجود کی تشکیک یا تنزّلات کا مفروضہ پیش کیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر عدم میں تشکیک نہیں تو وجود میں کیسے ہو سکتی ہے؟ نیز اگر وجود ایک ہے، مشترکِ معنوی بھی ہے، بسیط بھی ہے اور وہ خدا ہے، تو کیا خدا میں تشکیک ہو سکتی ہے؟ تشکیک کا لازمہ ترکیب ہے۔ بساطت اور تشکیک کو ایک ساتھ فرض کرنا اجتماعِ نقیضین ہے۔

علامہ اپنی غلط بات کو منوانے کے لیے روشنی میں شدت کی مثال لاتے ہیں۔ مگر یہ قیاس مع الفارق (false analogy) ہے۔ کیونکہ روشنی مرکب ہے، ذاتاً واحد نہیں ہے۔ سورج کی روشنی سورج کا جزو ہے۔ سورج میں نیوکلیائی دھماکوں سے روشنی پیدا ہوتی ہے اور

اس کے اخراج سے سورج کی کمیت (mass) میں مسلسل کمی واقع ہورہی ہے۔روشنی کی شدت کا تعلق اسکے ذرات کی تعداد سے ہوتا ہے۔

یہی حال حرکت کا ہے۔اس میں شدت وضعف اس لیے ہے کہ اسکو اجزاء میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ خارج میں توانائی کے فرق سے پیدا ہوتی ہے اور اسے توانائی کے استعمال سے بڑھایا یا بالکل ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ علامہ کو تو یہ سب معلوم نہ تھا،انہوں نے تو سکول کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن جو لوگ ہائی سکول میں روشنی کو منشور سے گزار چکے یا حرکت کی مساواتیں حل کر چکے ہیں،انکو غور کرنا چاہیے۔

آزمائے کو آزمانا نادانی ہے

مسلم دنیا پر مغربی اقوام کے قبضے کی بنیادی وجہ مسلمانوں کی تعلیم کا شکست کھا جانا تھا۔ انتظامیہ کو چلانے والے ان پڑھ نہیں ہوتے تھے۔ وزراء اور افسران مدرسوں سے یہی صوفیانہ خیالات پڑھ کر نکلے ہوتے تھے۔ معقولات سیکھنے والوں کے دماغ انہی وحدت الوجود اور تنزلاتِ وجود کی فرضی کہانیوں نے بانجھ کر دیئے تھے۔ یہ جسے علم سمجھ رہے تھے، وہ علم نہیں تھا۔ یہ اشیاء کی ماہیت کو سمجھنے پر اپنی توانائیاں صرف کرنے کے بجائے وجود کے نام پر ایک خیالی دنیا بسا بیٹھے تھے۔ برصغیر میں انگریز آئے تو فرنگی محل والے اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ انہی چیزوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ رفیع الدین نے ان کے عقیدۂ وحدت الوجود پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ''دمغ الباطل'' ہے اور اس میں کئی مقامات پر ملا صدرا کے نظریات بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً

مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ سے ان کی کتاب کے شائع کئے گئے نسخے میں صفحات 411،455اور 499ملاحظہ فرمائیں۔اس نسخے کی تصحیح کاکام مولاناعبدالحمید سواتی نے کیا ہے۔آج بھی جو شخص اس جعلی فلسفے کو اچھی طرح رٹ لے اور اس پر سنجید گی سے ایمان رکھتا ہو، وہ کسی علم میں آگے نہیں جاسکتا۔ غفران مآب (متوفی 1820ء) نے اس فلسفے کے رد میں ''الشہاب الثاقب،،لکھی، لیکن تعلیمی مراکز کی روش پر زیادہ اثر نہ ہوا۔

18. اصالتِ ماہیت اور مکتبِ خراسان

ملا صدرا لکھتے ہیں:

”ایسی تمام چیزیں جو ہمارے سامنے ہیں ہر ایک کے لیے ایک ماہیت ہوتی ہے اور ہر ایک کے لیے انیت اور ہستی ہوتی ہے۔ ماہو (یا وہ کیا ہے) اس سوال کے جواب میں جو چیز واقع ہوتی ہے اس کا نام ماہیت ہے۔ جس طرح وہ کتنا ہے یا کم ہو کے جواب میں جو چیز واقع ہوتی ہے اس کا نام کمیت اور مقدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہیت ہمیشہ ایک کلی مفہوم ہوتی ہے اور ایسی شے جس کی معرفت مشاہدے کے سوا کسی اور ذریعے سے ممکن نہ ہو اس پر وہ صادق نہیں آتی۔ اور کبھی ماہیت کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ وہ چیز جس کی وجہ سے شے وہ شے ہو، اسی کا نام ماہیت ہے۔[1]“

”جمہورِ متکلمین یہ کہتے ہیں کہ وجود ایک عرض ہے جو ماہیت کے ساتھ قائم ہے، واجب اور ممکن میں وجود کا یہی حال ہے۔ مشائی حکما کا مشہور مذہب یہ ہے کہ ممکن میں تو وجود کا یہی حال ہے بعین طور عرض کے ماہیت میں قائم ہے۔ لیکن واجب میں وجود عین ذات

---

1 ”فلسفۂ ملا صدرا“، ترجمہ اسفار اربعہ از سید مناظر احسن گیلانی، صفحہ 307، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

ہے۔ان کے مذہب کی صحیح تاویل وہی ہے جو گذر چکی، یعنی ممکن کا وجود ماہیت پر ذہناً زائد ہے۔[1]"

ملا صدرا خود اصالتِ وجود کے قائل ہیں جو درست نہیں۔ جدید سائنس نے یہ بتایا ہے کہ چیزیں مرکبات (molecules) سے مل کر بنی ہیں۔انکی صفات مرکبات کی ترتیب اور صفات کا مجموعی اظہار ہوتی ہیں۔ شکل، رنگ، سختی، درجہ حرارت، کمیت، بجلی کے ساتھ تعامل، مقناطیسیت، وغیرہ سب مرکبات کی صفات کا مجموعی اظہار ہوتا ہے۔ مرکبات کا ملنا اور اس سے صفات کا ظاہر ہونا ماہیت کہلاتا ہے۔ ماضی میں ماہیت کو جوہر اور اعراض کا مجموعہ کہا جاتا تھا،اب معلوم ہوا کہ جوہر اصل میں مرکبات سے بنا ہوتا ہے اور اعراض انہی مرکبات کی صفات کا ایک نظم و ترتیب میں مجموعی اظہار ہوتے ہیں۔

ہم جب ماہیت کا تجربہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں وجود کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ وجود خود سے اصالت نہیں رکھتا، خارج میں صرف ماہیت ہوتی ہے۔ دماغ میں وجود چیزوں کی ماہیت کے ہو بہو عکس کی شکل میں نہیں بلکہ ذرات کی ترتیب کی شکل میں محفوظ ہوتا ہے۔[2]

---

[1] "فلسفۂ ملا صدرا"، ترجمہ اسفار اربعہ از سید مناظر احسن گیلانی، صفحہ 170، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

[2] وہاراامباکر، "لچکدار دماغ (قسط12)"، مکالمہ، 25اکتوبر2022ء۔

"ایسا نہیں کہ ہمارے دماغ میں کوئی ویڈیو سکرین لگی ہے جہاں پر آنکھ سے موصول ہونے والا ڈیٹا براہِ راست ایک فلم چلاتا رہتا ہے۔ اس دنیا کا ادراک کرنے کے لیے دماغ کو بصری ڈیٹا کا ترجمہ کرنا ہے اور پھر (بقیہ اگلے صفحے پر)

اسے encode کرنا ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ صرف حسیاتی ڈیٹا بلکہ تمام ڈیٹا کے ساتھ ایسا ہے۔ یہ فیکٹ کہ ''برف دراصل جما ہوا پانی ہے'' سے لے کر اس چیز کو سمجھنا کہ ''اپنے پالتو کتے کا نام شیطان رکھنا نامناسب ہے''، ہمارا علم، خیالات اور دیگر انفارمیشن کی نمائندگی ان نیورل نیٹورک میں ہے اور یہ سادہ انفارمیشن کے فقروں کی صورت میں نہیں۔

ہمارے آسان ترین تصورات بھی دنیا کی گہری سمجھ کا نتیجہ ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک فون نمبر یاد کرتے ہیں۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہو کہ دماغ اسے اعداد کی لڑی کی صورت میں سٹور کرے۔ یا پھر ویسے جیسے کاغذ پر لکھے اعداد کی تصویر کھینچ کر انہیں یاد رکھے۔ کیا آپ اپنا فون نمبر الٹا کر بتا سکتے ہیں؟ کوشش کر کے دیکھئے۔ اس میں لگنے والی بہت سی اضافی محنت یہ دکھاتی ہے کہ دماغ میں یہ ایسے سٹور نہیں ہوتا۔ اگر یہ کاغذ پر لکھا ہوتا تو الٹا کر پڑھنا مشکل نہ ہوتا۔ لیکن یہاں پر ہونے والی مشکل کی وجہ دماغ میں فون نمبر کی representation ہے۔

سن 1997 میں بڑی ہیڈلائن اس وقت بنیں جب آئی بی ایم کے کمپیوٹر ڈیپ بلیو نے شطرنج کے عالمی چیمپئن کو شکست دے دی۔ اس مشین کو بنانے والی ٹیم کے لیے پہلا کام یہ تھا کہ یہ طے کیا جائے کہ پروگرام کے لیے اندرونی طور پر شطرنج کی representation کیا ہو گی۔ اس کے لیے ممکنہ چالوں کا درخت بنایا گیا۔ ان کے ممکنہ جوابات کا۔ رولز بنائے گئے جو کہ بساط کی حالت کو value دیتے تھے۔ اور یہ اس بات کو طے کرتا تھا کہ جب ڈیپ بلیو چال کا سوچتے وقت کرتا کیا تھا۔ یہ بساط کا تجزیہ کرتا تھا۔

اس مشین کے حریف کاسپاروف تھے۔ ان کا دماغ شطرنج کی چالوں کو ڈیپ بلیو والے طریقے سے represent نہیں کرتا تھا۔ ان کا طریقہ کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ یہ معنی خیز پیٹرن کا مجموعہ تھا۔ شطرنج کے مہروں کے کسی گروپ کو ایک دوسرے کے دفاع اور حملے کے لیے ایک یونٹ کے طور پر دیکھتے تھے۔ یہ دیکھتے تھے کہ بساط کے کس اہم خانے پر کس کا زور ہے۔

اس کھیل کو bottom up نیورل نیٹورک والے طریقہ سے دیکھنے انسانی دماغ کے لیے قدرتی ہے۔ جبکہ پروگرامرز کا بنایا ہوا ممکنات کا درخت کمپیوٹر کے لیے روایتی top down ڈیزائن ہے۔ دماغ میں مجموعی حکمتِ عملی اور اصولوں کا تجزیہ ہے اور سیکھتے رہنے کا لچکدار طریقہ ہے۔ کمپیوٹر کا طریقہ قدم بہ قدم منطقی تجزیے کا ہے۔ اس کے لیے ایک فیصلہ ایک بڑی ریاضی کی کیلکولیشن ہے۔ اس سے جواب نکل آتا ہے لیکن اس جواب کی تصوراتی سمجھ نہیں ہوتی۔ اور سیکھنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔''

چیزیں حقیقت میں ماہیت ہوتی ہیں اور انکی ماہیت کے بدلنے سے ہمارے ذہن میں ان کے وجود کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ جیسے میز کو توڑ کر کرسی بنالی جائے تو اسکی جگہ نیا وجود لے لیتا ہے۔ جدید سائنس و ٹیکنالوجی اصالتِ ماہیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیبارٹری میں تجربات ماہیت پر ہوتے ہیں اور جدید ایجادات کی ماہیت سامنے آنے پر انکے وجود کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ موبائل فون دو عشرے پہلے وجود نہیں رکھتا تھا، اسکی ماہیت ترتیب پائی تو کائنات میں ایک نئے موجود کا اضافہ ہوا اور ماہیت میں تبدیلیوں سے وہ سمارٹ فون کا وجود اختیار کر گیا۔اس کے برعکس اصالتِ وجود کا مغالطہ کوئی پیش گوئی فراہم نہیں کرتا، الٹا علمی پیشرفت کو روکتا ہے۔ جو لوگ اس بات کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھنا چاہیں وہ دسویں جماعت کی سائنس کی کتابوں کے ابواب کے آخر میں دیئے گئے سوالات کو اصالتِ وجود کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کریں۔

یہی معاملہ خودشناسی کا بھی ہے۔ حمل ٹھہرنے سے پہلے بچے کے اجزاء والدین کے وجود کی شناخت میں شامل ہوتے ہیں اور جب والدین سے جدا ہوا کر ایک الگ ترتیب میں اکٹھے ہوتے ہیں تو بچے کی ماہیت بنتی ہے۔اپنے ہونے کا احساس پیدائش کے کئی ماہ بعد بچے میں پیدا ہوتا ہے جو اپنی ماہیت کے تجربے کی تکرار کا نتیجہ ہوتا ہے۔بچے کے دماغ میں اپنے وجود کا تصور بننے میں ایک عرصہ لگتا ہے، جو بار بار آنے والے عصبی پیغامات کے دماغ میں حافظے کا حصہ بن جانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس سے پہلے والدین اور دوسروں کے لیے تو وہ موجود

ہوتا ہے کہ وہ اسکے کلی وجود کا تجربہ کر رہے ہوتے ہیں، لیکن اپنے ہونے کا احساس اسے زندگی کے ابتدائی ناگزیر تجربات کے بعد ہوتا ہے۔قرآنِ کریم میں آیا ہے:

وَاللَّه أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا.[1]

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا ہے کہ اس وقت تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔''

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس میں زبان سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، دماغ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں عقل پیدا ہو سکتی ہے۔ انسان کا بچہ بڑا ہو کر زبان سیکھتا ہے اور ثقافت سے تعامل کے نتیجے میں اپنی زندگی کا معنی essence تلاش کرتا ہے اور اس طرح اسکا وجود تشکیل پاتا ہے، اور اس عمل میں وہ نہ پوری طرح آزاد ہوتا ہے اور نہ جبرِ محض کا تابع ہوتا ہے۔

پتھروں، کرسی، میز، بریانی کی پلیٹ میں پڑی مرغی کی ٹانگ، وغیرہ میں چونکہ عصبی نظام (nervous system) نہیں ہوتا لہٰذا ان میں اپنے وجود کی تصویر بھی نہیں بنتی۔ عصبی نظام کی معلومات کو ماضی میں علمِ حضوری کہا جاتا تھا، اب پتا چلا ہے کہ یہ بھی علمِ حصولی کا ہی شعبہ ہے اور جہاں عصبی نظام خطا کھا جائے، وہاں علمِ حضوری میں نقص آ جاتا ہے۔ جیسا کہ 2013ء میں اونچائی سے گرنے کے بعد ہسپتال جا کر ٹیکہ لگنے سے عمران

---

[1] سورہ النحل، آیت 78۔

خان صاحب کا درد خوشی میں بدل گیا تھا۔[1] سائنس عقل کی عصمت کی منکر ہے، اسی لیے اس میں اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

ایران میں سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں فلسفے کا مکتبِ اصفہان وجود میں آیا جس کی بنیاد اصالتِ وجود کے مغالطے پر تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب یورپ میں یونانی خیالات سے آزادی کا نتیجہ جدید سائنس کی تشکیل کی شکل میں نکل رہا تھا لیکن وہ کتابیں عربی میں ترجمہ نہیں ہو رہی تھیں۔ مکتبِ اصفہان کا عروج ملا صدرا (متوفی 1640ء) کی شکل میں ہوا، جو اپنے ناول ''اسفارِ اربعہ'' کی ابتداء ہی اصالتِ وجود کے مغالطے سے کر کے بعد میں وحدتِ وجود کی تائید اور معادِ جسمانی کے انکار تک جا پہنچتے ہیں۔ ان نظریات کے خلاف شیعہ متکلمین نے شدید ردِ عمل دیا اور ان کے آپس میں دوری بہت ہو گئی۔ چنانچہ ملا صدرا نے ''رسالۂ سہ اصل'' کے عنوان سے ایک مستقل کتابچے میں دوسرے علما کے خلاف خوب بھڑاس نکالی۔ علامہ مجلسی (متوفی 1699ء) اپنے ''رسالۂ لیلیہ'' میں لکھتے ہیں:

''صوفیوں کی بد اخلاقی کا یہ حال ہے کہ کوئی ان سے بات نہیں کر سکتا۔ ان میں تکبر اور احساسِ برتری اتنا ہے کہ خود کو انبیاءؑ سے بھی بلند سمجھتے ہیں۔ یہ سب کو کمتر سمجھتے اور لوگوں

[1] https://www.bbc.com/urdu/pakistan-51278717

سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ یہی زوال انکی باقی اقدار پر بھی آیا ہے لیکن اسکا احساس اُسے ہوتا ہے جو اِن کے ساتھ کچھ وقت گزار لے۔[1]''

مسلم فلسفے کے مکتبِ اصفہان نے جہاں ایک طرف شیعہ مدارس میں عقلی علوم کو پسند کرنے والوں کو تصوف کے اندھیرے میں دھکیلا، وہیں عقلی علوم کو متکلمین کی نظر میں مشکوک بنا دیا، جس سے سائنسی کام کے لیے درکار افرادی قوت بہت کم ہو گئی۔ چنانچہ مسلمانوں کی سائنس پر جو اثر خواجہ طوسی (متوفی 1274ء) نے ڈالا تھا اور منگول حملے کے بعد اسے نئی زندگی بخشی تھی، ملا صدرا کا کام اس کا الٹ ثابت ہوا اور انہوں نے سب کچھ تباہ کر دیا۔ اب اس فلسفے کو خیر آباد کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مدارس میں فلسفے کا نصاب کچھ تاریخِ فلسفہ پڑھانے کے بعد جدید علوم کے خلاصے پر مشتمل ہوتا کہ طلاب قدماء کی غلط فہمیوں میں وقت ضائع نہ کرتے رہیں۔ جدید دور میں جرمن فلسفی کانٹ کا فلسفہ شیعہ احادیث کے زیادہ قریب ہے۔

دلیل بر اصالتِ ماہیت از آیۃ اللہ جواد تہرانی

بیسویں صدی عیسوی میں ایران کے شہر مشہد میں آیۃ اللہ مہدی اصفہانی (متوفی 1945ء) نے شیعہ دینی فلسفے میں مکتبِ خراسان کی بنیاد رکھی جو عقل کی عصمت کا منکر ہے۔ البتہ اس مکتب کو زیادہ سرکاری سرپرستی نہیں مل سکی اور مخالفین نے اسے عقل دشمن قرار دیا۔ ذیل

---

[1] علامہ باقر مجلسی، ''العقائد''، صفحہ 100، مؤسسۃ الہدیٰ للنشر والتوزیع، تہران، 1999ء۔

میں اس مکتب کے ایک نمائندے آیۃ اللہ جواد تہرانی (متوفی 1989ء) کی کتاب ''عارف وصوفی چہ می گویند'' سے ایک فصل کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ قاری میں باقی کتاب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر باشعور عقلمند انسان جب خدا کے دیئے ہوئے فہم و شعور اور علم و عقل کی روشنی میں خارجی حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ اشیا اور ماہیات، مثلاً انسان، گھوڑا، گائے، درخت، پتھر، وغیرہ، خارج میں، حقیقت میں اور اولیت کے ساتھ ذاتی طور پر حقیقی اور واقعی ہیں۔ یعنی انسان اپنی فطرتِ سلیم کے ساتھ اس فیصلے پر پہنچتا ہے کہ ذہن سے باہر انسان، گھوڑا، گائے، درخت، پتھر وغیرہ حقیقتاً متحقق ہیں۔ (نہ یہ کہ یہ چیزیں اور ماہیات ثانوی اور مجازی اور عرضی حیثیت میں ہوں اور ایک علیحدہ چیز بنام ''وجود'' اولیت رکھتے ہوئے ذاتی حیثیت میں موجود ہو اور ان چیزوں کے تحقق میں واسطے کا کردار ادا کرتی ہو۔) وجود کا عنوان محض ایک مفہوم ہے جو ان اشیاء اور ماہیات سے اخذ کرنا اور ان سے منسوب کرنا انسان کی مجبوری ہے۔

دوسرے الفاظ میں انسان فطری شعور کی روشنی میں واقعیاتِ خارجیہ، مثلاً انسان، گھوڑا، گائے، درخت، پتھر، وغیرہ، کو مفاہیم کا حقیقی مصداق سمجھتا ہے۔ پس فطرتاً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسان، گھوڑا، گائے، درخت، پتھر، وغیرہ ذہن سے باہر سچ مچ میں موجود اور متحق ہیں۔ اور وجود، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، محض ایک اخذ شدہ مفہوم ہے جو واقعات سے اور ماہیت کے حقیقی مصادیق سے حاصل کیا جاتا ہے۔ پس ہم شعور کی روشنی اور عقل

کی فطرت سے خارج میں ماہیت کے اصیل ہونے اور موجود بالذات ہونے کو درک کرتے ہیں نہ کہ اس کی اعتباریت و ذہنیت اور موجودیت بالعرض کو! (بیشتر توضیح کے لیے قاریانِ محترم کتاب کے حاشیے سے غافل نہ رہیں)۔ یہ طے کرنا کہ ماہیت حقیقت میں متحقق اور موجود ہے (اولیت کے ساتھ اور بالذات، نہ مجازی یا ثانوی حیثیت میں بالعرض)، فطری ہے اور اس کو درک کرنا ہر عقلمند انسان کے لیے اپنی پاک صاف فطرت کے ساتھ بہت آسان ہے اور خارجی ماہیات کے حقیقی ہونے کا انکار اپنے آپ پر زبردستی ٹھونسے بنا ممکن نہیں اور یہ فطرتاً جائز نہیں ہے۔ اور ایسے میں کہ ابھی تک اس فطرت کے خلاف ہمارے نزدیک کوئی دلیل و برہان بھی قائم اور تمام نہیں ہو سکی، عقلی طور پر یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ ہم اس فطری تقاضے سے ہاتھ اٹھا لیں؟ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِى فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ. (ترجمہ: پس آپ یک سو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے کو بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ سورہ روم، آیت 30)۔"[1]

---

[1] آیۃ اللہ جواد تہرانی، "عارف و صوفی چہ می گویند"، صفحات 277 تا 280، نشر آفاق، تہران، 2010ء۔

19. روشنی کے بارے علامہ طباطبائی کی غلط فہمیاں

جزئی و حسی معلومات تو انسان شکمِ مادر میں ہی حاصل کرنے لگتا ہے۔ وہ پیدائش سے پہلے بہت سی چیزیں سیکھ چکا ہوتا ہے۔ بعد میں بچپن میں ناگزیر تجربات سے بنیادی مفاہیم سیکھتا ہے۔ البتہ انسانی ذہن کو صحیح سوچنا سیکھنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جدید ریاضیاتی منطق اور جدید سائنس انسان کے لیے ضروری ہیں۔

معلومات اکٹھی کرنے کو علم نہیں کہا جا سکتا، نیز وہ غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ علم ایسے نظریات کو کہا جا سکتا ہے جو ذہن کو باہر کی دنیا کے بارے میں درست پیشگوئی کرنے کی صلاحیت دیں۔ جیسے تاریخ کا علم ماضی کے آثار کے بارے میں وضاحت دیتا ہے اور انکی قابل تصدیق توجیہ کرتا ہے۔ یا جیسے سائنس کا علم تجربے سے پرکھا جا سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر نئے موجودات بنائے جا سکتے ہیں۔

آج علم ایٹم جیسی سادہ چیز کے بارے میں مکمل طور پر درست پیش گوئی کر سکتا ہے۔ لیکن انسان چونکہ کروڑوں مالیکیولز کی ایک پیچیدہ ترکیب سے مل کر بنا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں ہمارا علم مکمل نہیں، اور شاید کبھی نہ ہو سکے۔ معاشرہ چونکہ انسانوں سے مل کر بنتا ہے تو وہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یہاں فلسفہ باقی کی جگہ بنتی ہے، جو علم نہیں لیکن درست سوچنے کی کوشش میں جمع کئے گئے خیالات ہیں جو سماجی زندگی میں فرد کی مدد کرتے ہیں۔ البتہ اگر یہ خیالات علم کے پابند نہ ہوں تو وہ باطل فلسفہ بن جاتا ہے۔ فلسفے کو علم کا پیرو ہونا

چاہیے۔ چنانچہ مغرب میں جب خواجہ طوسی (متوفی 1274ء) کی علمِ ہیئت میں تحقیقات پہنچیں اور ان کو آگے بڑھاتے ہوئے کوپرنیکس (متوفی 1543ء) اور گلیلیو (متوفی 1642ء) نے جدید علم کی بنیاد رکھی، تو اس کے بعد مغرب میں جدید فلسفہ بھی شروع ہوا۔

مسلم دنیا میں علم سے دوری

عباسی دور میں مسلم دنیا میں جو علمی پیشرفت ہوئی اس سے مسلم فلسفیوں نے فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنے یونانی اسلاف کے سلفی بن کر رہ گئے۔ ابن الہیثم (متوفی 1040ء) نے کتاب المناظر اور دیگر کتب میں روشنی اور طبیعت کے بارے یونانی نظریات کو مشاہدات اور عقلی دلائل سے رد کیا۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ آنکھ سورج کی طرح روشنی خارج نہیں کرتی بلکہ روشنی باہر سے آنکھ میں پڑتی ہے تو اس سے ذہن میں تصویر بنتی ہے۔ سایہ روشنی کی صفت ہے، جہاں سے روشنی نہ گزرے وہاں سایہ بنتا ہے۔ کیمرے کی تصویر بنیادی طور پر چیزوں کا سایہ ہوتا ہے، جو روشنی کے اس حصے کے انعکاس سے بنتی ہے جو جذب نہ ہُوا ہو۔ چنانچہ جب کوئی چیز سب رنگ جذب کر لے تو اسکی تصویر سیاہ ہوتی ہے، جیسے سر کے بالوں کا عکس، وغیرہ۔ ابن الہیثم عراقی تھے اور یہ کام انہوں نے مصر میں جیل میں قید کے دوران کیا تھا۔

ابن الہیثم کی روشِ تحقیق، ان کی تحقیق کے نتائج سے زیادہ اہم ہے۔ انہوں نے سائنسی طرز فکر کے بنیادی خدوخال بھی پیش کئے تھے۔ 2015ء میں اقوام متحدہ کی طرف سے

کتاب المناظر کے لکھے جانے کے ہزار سال مکمل ہونے پر عالمی سال برائے روشنی کا اعلان کیا گیا۔ مغربی ممالک کی سبھی یونیورسٹیوں میں جشن منایا گیا۔ لیکن ابن الہیثم ہوں یا خواجہ طوسی، انکے سائنسی کام کو مغرب نے ہی اہمیت دی ہے۔ اگرچہ جدید علم ان سے بہت آگے جا چکا ہے، لیکن پھر بھی وہاں انکا دن منایا گیا۔ روشنی پر تحقیق کرنے والے خود کو ابن الہیثم کی روایت کا امین سمجھتے ہیں۔

امام غزالی کا کردار

مسلم دنیا میں امام غزالی (متوفی 1111ء) نے یونانی فلسفے پر تنقید کی مگر اسکو علم کے پیچھے چلانے کے بجائے تصوف کے پیچھے چلانے پر زور دیا، جو گڑھے سے نکل کر کنویں میں کودنے جیسی بات تھی۔ بعد کے مسلم فلسفی تصوف ہی کو فلسفیانہ رنگ دیتے رہے۔ ان کی کتب میں ''احیاء العلوم''، ''منہاج العابدین'' اور ''کیمیائے سعادت'' وغیرہ صوفیوں کی طرف جھکاؤ کو ظاہر کرتی ہیں۔ ملا صدرا (متوفی 1641ء) صوفیوں کے امام جناب غزالی کی احیاء العلوم سے ایک عبارت نقل کر کے ان الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں:

''یہ شخص جو کافۂ انام میں امام اور حجۃ الاسلام کے نام سے موسوم ہے، علم کے اس دریائے ذخار کے کلام کو میں نے اس لیے پیش کیا ہے تاکہ وہ لوگ جو اہلِ ایمان کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں، ان کے قلوب میں اطمینان کی نرمی پیدا ہو۔''[1]

---

[1] فلسفۂ ملا صدرا، ترجمہ اسفار اربعہ، صفحہ 523، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ملا صدرا توسل بہ شخصیت کا مغالطہ استعمال کر رہے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے مریدوں کو فلسفی نہیں کہنا چاہیے۔

مُلا صدرا اور روشنی

مُلا صدرا کی کتب میں آنکھ کے بارے یونانیوں کے باطل تصورات ہی ملتے ہیں اور ابن الہیثم کے کام اور ان کی روش کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ مثلاً اسفار میں سورج کے نور کو چمگادڑ کی آنکھ کے نور سے شدید تر قرار دیتے ہیں۔[1] وہ روشنی کو بسیط ماننے پر بضد تھے۔ سورج کی روشنی کا رنگوں سے مرکب ہونا چونکہ ان کے صوفیانہ عقیدے سے ہم آہنگ نہ تھا، تو اس کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ذرا اس کے سمجھنے کے لیے تم آفتاب کے انوار اور اس کی روشنی پر نظر ڈالو کہ عالم محسوسات میں خدا کی وہی ایک مثال ہے۔ دیکھو، آفتاب کے یہ انوار کس طرح مختلف رنگ کے شیشوں میں پہنچ کر طرح طرح کے رنگوں سے رنگین نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان انوار کا اپنی ذات کی حیثیت سے کوئی رنگ ذاتی رنگ نہیں ہے، البتہ (مختلف شیشوں) کے ان انوار میں اگر کوئی واقعی تفاوت پیدا ہو سکتا ہے تو وہ صرف چمک کی شدت و ضعف کا ہو سکتا ہے۔ تو وہ جو ان ہی شیشوں اور ان کی رنگینیوں یا نور کے ان ادنیٰ مراتب اور تنزلی درجات میں الجھ

---

[1] (الف) فلسفۂ ملا صدرا، ترجمہ اسفار اربعہ، صفحہ 43، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔ (ب) ملا صدرا، "اسفار اربعہ (عربی)"، جلد 1، صفحہ 69، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

کر رہ گیا وہ نورِ حقیقی کی یافت سے محروم ہو گیا، اور نورِ حقیقی خود اس سے روپوش ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک ماہیات حقیقی اور متاصل الوجود امور ہیں، اور وجودات ان کے خیال میں صرف انتزاعی اور ذہنی معانی ہیں۔

لیکن جو نور کے مختلف رنگوں کا مشاہدہ کر کے یہ سمجھ گیا کہ یہ سارا کھیل شیشوں کا ہے، ورنہ ان میں سے نور کا کوئی اصلی رنگ نہیں ہے، یقیناً اس پر خود نور کا ظہور ہو جائے گا اور وہ معلوم کر لے گا کہ اسی نور کے مختلف مراتب ہیں جو اعیان اور خارج میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق ظاہر ہوئے ہیں۔ اور یہ مسلک ان لوگوں کا ہے جن کا خیال ہے کہ وجود ہی کے مختلف مراتب (جو حقیقی اور واجبی نور کے لمعات ہیں اور وجودِ حقیقی الہٰی کے ظہورات ہیں) کا ظہور اعیان کی صورت میں ہوا ہے اور وہی مختلف ماہیاتِ امکانیہ کے رنگوں سے رنگین ہوا ہے اور مخلوقاتی صورتوں نے اس کی واجبی اور الٰہی صورت کو انہی کے اندر چھپا دیا ہے۔ "[1]

جو لوگ اصل عربی متن دیکھنا چاہیں وہ بیروت کی چھاپ میں جلد اول کے صفحات 69 اور 70 کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے میٹرک میں منشور (prism) سے سورج کی روشنی گزاری ہے یا قوس قزح کو سمجھا ہے، وہ اس جہالت پر ہنسیں گے۔ لیکن ان کو یہ یاد

[1] (الف) فلسفۂ ملا صدرا، ترجمہ اسفار اربعہ، صفحہ 44، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔ (ب) ملا صدرا، "اسفار اربعہ (عربی)"، جلد 1، صفحہ 70، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

رکھنا چاہئے کہ ملا صدرا نیوٹن (متوفی 1727ء) سے پہلے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کے بعد بھی آتے تو بھی نیوٹن کے کام سے ناواقف رہتے کیونکہ ان کے ذہن پر تصوف کا ناگ مسلط تھا۔ جیسے بیسویں صدی میں علامہ محمد حسین طباطبائی (متوفی 1981ء) بھی روشنی کے بارے صحیح علم سے محروم رہے ہیں۔ ذیل میں ان کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔

علامہ طباطبائی کی عبارت

علامہ طباطبائی کی کتاب بدایۃ الحکمہ کا ترجمہ توضیح البدایہ کے نام سے جامعۃ المنتظر کے زیر اہتمام 2009ء میں چھپ چکا ہے۔ یوں تو یہ پوری کتاب ہی مغالطات کا پلندہ ہے، یہاں اختصار کے پیشِ نظر روشنی کے بارے انکے فرمودات کو بطور نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔ توضیح البدایہ میں صفحہ 23 پر ایک فصل شروع ہوتی ہے جس کا عنوان ہے: "في ان الوجود حقيقة واحدة مشككه"، اور اس میں علامہ طباطبائی تشکیک کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسکی مثال روشنی ہے جو خود بخود روشن بھی ہے اور غیر کو روشن کرنے والی ہے۔ جب آپ روشنی کو دیکھیں گے تو کوئی بلب ہزار واٹ کا ہے اور کوئی صفر کا، ہزار والا شدید ہو گا اور صفر والا ضعیف ہو گا۔ لیکن فقط یہ دو درجے نہیں بلکہ صفر سے ہزار تک کئی درجے بن سکتے ہیں۔ مثلاً سو کا، دو سو کا، وغیرہ۔ لیکن روشنی روشنی ہے۔ ہزار کا ہو تب بھی روشنی ہے اور صفر کا ہو تب بھی۔ ہزار واٹ والے کو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کئی روشنیاں مل کر یہ بنی ہے۔

اور صفر والے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں ہزار درجہ تاریکی اور ایک درجہ روشنی ہے۔ بلکہ وہ بھی اپنی جگہ روشنی ہی ہے۔ اسکو ہم مرکب نہیں کہہ سکتے کہ یہ تاریکی اور روشنی سے مرکب ہے۔ لہٰذا روشنی زیادہ ہو تو بھی مرکب نہیں کہ کئی روشنائیاں ملکر روشنی بنی ہے، بلکہ یہ ہے۔ اور اگر روشنی کم ہو تو پھر بھی یہ مرکب نہیں کہ تاریکی اور روشنی ملکر کم روشنی بنی ہے۔ بلکہ یہ بھی اسی طرح بسیط ہے جس طرح زیادہ روشنی بسیط ہے۔

المختصر!

روشنی کا اطلاق اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ درجوں پر ہوتا ہے۔ جس درجے کو آپ اعلیٰ کہتے ہیں تو اس کے بارے میں یہ خیال نہ کریں کہ اس سے اوپر روشنی نہیں ہے۔ اور جسے ادنیٰ کہتے ہیں تو اسکے بارے میں بھی یہ نہیں کہیں کہ اس سے کم روشنی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس سے کم اور اعلیٰ سے زیادہ روشنی بھی ہو سکتی ہے۔ اسکا اصطلاحی لفظ نورِ حسی ہے۔ اور نورِ حسی کلی مشککک ہے۔ اسکا تمام پر (اطلاق یا تشکیک) ہو رہا ہے، کسی پر کم اور کسی پر زیادہ۔ اور یہی حال بعینہٖ وجود کا ہے۔ بلب والی نورِ حسی کی مثال تھی۔ اور وجود نورِ حقیقی ہے۔"[1]

تبصرہ

بسیط چیزوں میں شدت وضعف محال ہے۔ روشنی ذرات (photons) سے مرکب ہوتی ہے اور اسکی شدت (intensity) کا تعلق ذرات کی تعداد بڑھنے سے ہوتا ہے۔

---

[1] توضیح البدایہ، صفحات 23،24، دار التحقیق والتالیف، جامعۃ المنتظر، لاہور، 2009ء۔

ہر رنگ (wavelength) کی روشنی کے ذرات مختلف ہوتے ہیں۔ جب ایک رنگ ہی کے ذرات والی روشنی پیدا کی جائے تو اسے لیزر کہتے ہیں۔ چنانچہ لیزر ہمارے ذہن میں خالص رنگ (colour) پیدا کرتا ہے۔ شدت وضعف کا تعلق ذرات کی تعداد کی زیادتی یا کمی سے ہوتا ہے۔ آج بلب، کیمرے، سمارٹ فون، ٹی وی وغیرہ، روشنی کی ترکیب کی درست فہم سے ہی بنائے جاسکے ہیں۔

آخر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ وجود ماہیت کا حصہ اور عرض ہوتا ہے، اسکو الگ کر کے غلط معلومات کی بنیاد پر خود سے تشکیک کا فلسفہ گھڑ لینا درست نہیں۔ جدید دور میں فلسفہ وہی درست ہے جو جدید علم کا پیرو اور خارجی حقائق سے ہم اہنگ ہو۔ تصوف کے جہلِ مرکب نے مسلم فلسفے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

عقیدۂ وحدت الوجود

تشکیکِ وجود کی داستان گھڑنے کا مقصد محیی الدین ابنِ عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کو معقول ظاہر کرنا ہے۔ اسفار اربعہ میں اسی صفحے پر آگے چل کر ملا صدرا فرماتے ہیں:

"حقیقت اور ذات کے اعتبار سے وجود اور موجود ایک ہیں۔ جیسا کہ کشف اور یقین والے بزرگوں اور عارفوں کا مسلک ہے۔ میں عنقریب اس کے لیے برہانِ قاطع پیش کروں گا کہ وجودات اگرچہ باہم ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ان میں باہم کثرت ہے،

لیکن یہ سب جو کچھ بھی ہے، وہ حقِ اول (یعنی وجودِ حق) کے تعینات اور اسی کے نور کے مختلف ظہورات اور اس کی ذات کے مختلف شئونات ہیں۔"[1]

اس پر ملا ہادی سبزواری (متوفی 1873ء) نے حاشیہ لگا کر توحید کے بارے مختلف نظریات بیان کئے ہیں اور ملا صدرا کے نظریۂ توحید کو خاصا سراہا ہے۔ آیت اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیم یہ حاشیہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"ان خاص عقیدۂ توحید رکھنے والوں پر حسنِ ظن کرنے اور اسے شریعت کے احکام سے ہم آہنگ ماننے کا لازمہ یہ ہے کہ ان کی باتوں کو ظاہری معنوں کے خلاف سمجھا جائے۔ ورنہ خالق و مخلوق اور آمر و مامور اور راحم و مرحوم کے وجود پر یقین رکھ کر ان باتوں کو کیسے درست کہا جا سکتا ہے؟"[2]

---

[1] (الف) فلسفۂ ملا صدرا، ترجمہ اسفار اربعہ، صفحہ 44، حق پبلیکیشنز، لاہور، 2018ء۔ (ب) ملا صدرا، "اسفار اربعہ (عربی)"، جلد 1، صفحہ 71، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

[2] آیۃ اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیم، مستمسک العروۃ الوثقیٰ، الطبعۃ الثالثۃ، جلد 1، ص 391، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

20. علامہ طباطبائی اور علماء کی توہین کا مسئلہ

بعض لوگ علماء پر تنقید کو توہین قرار دیتے ہیں اور اپنے ذہن کو بند رکھنے کی کوشش میں غصے میں آجاتے ہیں۔ صحیح روش یہ ہے کہ تنقید کرنے والے کی بات کو ٹھنڈے دماغ سے سمجھنا چاہئے اور اس کی غلطی کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر اس کی بات درست ہو تو اسے مان لینا چاہئے۔ ورنہ اختلاف رائے کے حق پر اتفاق کر لینا چاہیے۔

علامہ طباطبائی نے علماء پر بہت شدید تنقید کی ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے فرانس سے آنے والے ہنری کاربن کی صحبت کا اثر سمجھیں۔ فرانس سے 1979ء میں ایک جہاز بھی آیا تھا۔ لیکن اس کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جدید دور میں ایران سے صوفیت کا پھیلاؤ مغرب کی سازش ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ علامہ کی تنقید کو ان کے احساسِ کمتری کا اظہار سمجھیں جو ملا صدرا کی فکر سے انکو ملا ہو، یا مسلمانوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی سازش سمجھیں۔ یہ روش درست نہیں۔ سازش کی عینک سے ہر بات کو دیکھنا کند ذہنی کی علامت ہوتا ہے، جو علمی جواب نہیں دے سکتے وہ الزامات کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ملا صدرا کا ذہن مغرب زدہ اور فرسودہ یونانی فلسفے کا اسیر تھا لیکن علامہ طباطبائی کی شخصیت بہت پیچیدہ ہے۔ ان کے بارے کوئی رائے بنانے سے پہلے اردو میں ترجمہ شدہ کتاب "سیر وسلوک" کو کسی بلند پایہ اور متخصص ماہرِ نفسیات کے پاس لے جانا چاہئے۔

ملا صدرا کی مغرب زدگی

ملا صدرا اپنی کتاب مفاتیح الغیب میں قدیم مغربی مفکرین کی خدمت میں تو سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں[1] لیکن اسفار اربعہ میں علماء کے بارے میں بہت سخت الفاظ لکھتے ہیں:

"یہ لوگ فی الحقیقت صرف بدعت و گمراہی کے علمبردار ہیں، جہال اور کمینوں کے پیشوا ہیں۔ ان کی ساری شرارتیں محض اربابِ دین و تقویٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور علماء کو ہی نقصان اور ضرر پہنچاتے ہیں۔ ان کو سب سے زیادہ عداوت حکماء کے اس گروہ سے ہے جو ایمان والے ہیں اور فلاسفہ کی جماعت میں جوربانی ہیں۔ یہ جھگڑے والوں کا وہ طائفہ ہے جو معقولات کے اندر گھسنا چاہتے ہیں حالانکہ ابھی تک انہوں نے محسوسات ہی کا علم حاصل نہیں کیا۔ یہ براہین و قیاسات کو استعمال کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ابھی ریاضیات کو بھی انہوں نے درست نہیں کیا ہے۔ یہ الٰہیات پر گفتگو کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں حالانکہ ابھی یہ طبیعیات کے مسائل سے بھی ناواقف ہیں۔[2] "

زمانے کا ستم یہ ہے کہ خود ملا صدرا کی طبیعیات باطل ثابت ہو چکی ہے۔ علامہ طباطبائی کو تو اس بات کی سمجھ نہ تھی کیونکہ وہ کبھی سکول بھی نہیں گئے، لیکن باقی افراد کو سوچنا چاہیئے کہ

---

[1] ملا صدرا، "مفاتیح الغیب"، صفحات 379 و 380، انجمن اسلامی حکمت و فلسفہ ایران، تہران، 1984ء۔

[2] ملا صدرا، "اسفار اربعہ"، جلد 1، صفحہ 363، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1981ء۔

اب الٰہیات کے بارے ملا صدرا کے خیالات کی کیا وقعت رہ گئی ہو گی؟ یاد رہے کہ اصلی مغربی فکر وہی تھی جو یونانِ قدیم کا تسلسل تھی۔ جدید علوم مغربی نہیں کیونکہ یہ اس وقت سامنے آئے جب لوگوں نے اپنے جغرافیے سے باہر نکل کر تحقیقات کیں۔ لہٰذا جدید علوم میں پوری انسانیت کا حصہ ہے۔

فلوطین کے زندان میں

ایران کی دانشگاہ باقر العلوم کے استاد ڈاکٹر محمد مہدی گرجیان نے ثابت کیا ہے کہ ملا صدرا نے خود ہی بہت سے فکری اصول اثولوجیا سے اٹھانے کا اقرار کیا ہے۔[1]

ملا صدرا کی توحید بسیط الحقیقۃ کو کل الاشیاء سمجھنا ہے۔ یہ عقلاً محال ہے کیونکہ اجتماعِ نقیضین ہے۔ روشنی بھی اپنے ذرات کا مجموعہ ہوتی ہے، اس لئے ان کا کل ہوتی ہے۔ اس میں شدت وضعف اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ بسیط نہیں ہوتی۔ ملا صدرا نے وحدت الوجود کا یہ عقیدہ فلوطین اور ابنِ عربی سے لیا ہے۔ ایران میں دسویں صدی ہجری میں قائم ہونے والی صفوی سلطنت ایک صوفی سلسلے کے گدی نشین نے قائم کی تھی۔ ملا صدرا کا تعلق اشراف کے خاندان سے تھا اور دربار کی سوچ کی طرف ان کا جھکاؤ قابلِ فہم ہے۔

---

[1] محمد مہدی گرجیان، نرجس رودگر، ''انعکاس فلسفہ فلوطین در حکمت صدر المتألہین''، حکمت اسراء، بہار، شمارہ 11، 1391۔

متقدمین کے بارے علامہ طباطبائی کی رائے

علامہ طباطبائی ملا صدرا کی توحید کو درست سمجھتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے ہر کسی کو رائے رکھنے کا حق ہے، غلطی کرنے کا بھی حق ہے۔ ہم سب غیر معصوم ہیں، لہٰذا تکثر اچھی چیز ہے۔ اسی سے علم ترقی کرتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ پہلے ایک ہزار سال کے علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ان کا عقیدۂ توحید ٹھیک نہیں تھا۔ تفسیر المیزان میں علامہ موصوف فرماتے ہیں[1]:

وأما أہل الكلام من الباحثين فاحتجاجاتهم على التوحيد لا تعطى أزيد من الوحدة العددية أيضا فى عين أن ہذه الحجج مأخوذة من الكتاب العزيز عامة؛ فهذا ما يتحصل من كلمات أہل البحث فى ہذه المسألة.

ترجمہ: ''جہاں تک متکلمین کی بات ہے تو ان کے توحید کے بارے دلائل ایسے ہیں کہ اگرچہ عموماً وہ قرآن سے اخذ شدہ دلائل ہیں لیکن ان سے عددی وحدت سے بڑھ کر کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ یہی اس مسئلے میں اہلِ بحث کے کلام کا حاصل ہے۔''

فالذى بينه القرآن الكريم من معنى التوحيد أول خطوة خطيت فى تعليم ہذه الحقيقة من المعرفة، غير أن أہل التفسير والمتعاطين لعلوم القرآن من الصحابة والتابعين ثم الذين يلونهم أہملوا ہذا البحث الشريف، فهذه جوامع الحديث وكتب التفسير

---

[1] علامہ طباطبائی، ''تفسیر المیزان''، جلد 6، صفحہ 104، منشورات اسماعیلیان۔

المأثورة منهم لا ترى فيها أثرا من هذه الحقيقة لا ببيان شارح، ولا بسلوك استدلالى.

ترجمہ: ''لہٰذا توحید کے معنی کے بیان میں جو کچھ قرآنِ کریم میں آیا ہے وہ معرفت کی اس حقیقت کی تعلیم میں پہلا قدم ہے۔ لیکن مفسرین اور قرآن کے معارف کی وضاحت کی کوشش کرنے والے، چاہے معصومینؑ کے اصحاب ہوں یا تابعین ہوں یا ان کے بعد آنے والے لوگ ہوں، سب نے اس بحث کو مہمل رکھا ہے۔ تفاسیر اور حدیثوں کے مجموعوں میں، نہ شارح کے بیان میں اور نہ ہی استدلال میں اس حقیقت کے بیان کا کوئی اثر دکھائی دیتا ہے۔''

ولم نجد ما يكشف عنها غطاءها إلا ما ورد فى كلام الإمام على بن أبى طالب عليه أفضل السلام خاصة، فإن كلامه هو الفاتح لبابها، والرافع لسترها وحجابها على أهدى سبيل وأوضح طريق من البرهان، ثم ما وقع فى كلام الفلاسفة الإسلاميين بعد الألف الهجرى، وقد صرحوا بأنهم إنما استفادوه من كلامه عليه السلام .

ترجمہ: ''ہم نے اس سے پردہ اٹھانے والی کوئی بات نہیں دیکھی سوائے اس کے کہ جو امام علی ابن ابی طالبؑ کے کلام میں آیا ہے۔ بے شک ان کا کلام اس دروازے کا تالا کھولتا ہے اور اس چھپے راز سے پردہ اٹھاتا ہے۔ انہوں نے واضح انداز میں روشن دلیل کے ساتھ اس کی تشریح اور اثبات کیا ہے۔ ان کے بعد دسویں صدی ہجری کے بعد آنے والے مسلم فلاسفہ

کے کلام میں یہی حقیقت جلوہ گر ہے۔انہوں نے صراحت سے اقرار بھی کیاہے کہ انہوں نے یہ بات آنحضرتؐ کے کلام سے استفادہ کر کے سیکھی ہے۔"

ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ باتیں پہلے ایک ہزار سال کے شیعہ سنی علماء کی توہین محسوس ہوں۔ توحید جیسے اہم معاملے میں، کہ جس کے بارے کہا گیاہے کہ أَوّلُ الدّینِ معْرِفَتہُ، سب کو غلط فہمی کا شکار قرار دینا بہت سنگین بات ہے۔ یہ دنیاوی علوم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، اصولِ دین کی بات ہے۔ اگر یہ محض علمی تنقید ہے تو اس کا لائسنس صرف علامہ کے پاس تو نہیں ہے۔ دسویں صدی ہجری کے بعد آنے والے مسلم فلاسفہ سے مراد ملا صدرا (متوفی 1045 ہجری) اور ان کے پیروکار ہیں۔ ملا صدرا کی کتب سے ظاہر ہے کہ انہوں نے فلوطین کے کلمات کے ظاہر کو عقل کی گرہ بنالیا، جو اسلام کی آمد سے پہلے یہ فلسفہ پیش کر چکا تھا۔[3] فلوطین مصر میں پیدا ہوا تھا اور بعد میں اپنے مغربی آقاؤں کے پاس روم چلا گیا اور وہیں فوت ہوا۔ وہ اور اس کے پیروکار ہمیشہ حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت پر کمربستہ رہے۔ رومیوں نے جب مسیحیت کو قبول کیا تو یہ لوگ ان کے زیر اثر علاقوں سے نکل کر عرب و ایران چلے گئے۔ یوں نوفلاطونیت کا سلسلہ ابوجہل تک پہنچتا ہے۔ مشرکینِ مکہ اسی فلسفے سے متاثر تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ وجود بھی وحدتِ عددی ہے۔ کائنات کا ایک ہونا عددی معنوں میں ہی ہے۔ چنانچہ ملٹی وَرس تھیوری، کائنات کے ریاضیاتی تعدد پر ہی قائم ہے۔ آیۃ اللہ العظمیٰ صافی گلپائگانی نے علامہ طباطبائی کے نظریۂ توحید کو اپنی کتاب "نگرشی بر فلسفہ و

عرفان''میں باطل ثابت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو بھی علامہ کی طرح اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ دلچسپی رکھنے والے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ وہ فرماتے ہیں:

توصیف خدا بہ «غیر متناہی» و «مَن ہُوَ مُحِیطٌ بِوُجودِہِ عَلی ماسواہُ» مطلب دیگری است کہ با این دریافت ہاسازش ندارد و بہ قول شما بعد از ہزار سال طرحی رامی ریزد کہ برای این کہ گفتہ نشود این طرح جدید و جدا از ہدایتِ انبیاء و مکتبِ اسلام و اہل بیت علیہم السلام است تلاش کردہ اید بگویید: «در کلمات حضرت مولی الموحدین بہ آن اشارہ شدہ و پیشینیان بہ آن نرسیدہ اند»[1].

ترجمہ:''خدا کے «غیر متناہی» اور «مَن ہُوَ مُحِیطٌ بِوُجودِہِ عَلی ماسِواہُ» ہونے کی صفت کا مطلب کچھ اور ہے، جو ان دریافتوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آپ خود مان رہے ہیں کہ یہ معنی ہجرت کے ہزار سال بعد تجویز ہوا ہے۔ اس خوف سے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ نئی تشریح ہے اور انبیاءؑ اور مکتبِ اسلام اور اہلبیتؑ کی تعلیمات کے منافی ہے، یہ کہہ رہے ہیں کہ: «حضرت مولی الموحدین علیہ السلام کے کلام میں اس کی طرف اشارہ ہوا، مگر متقدمین اس کو پا نہ سکے»۔''

[1] آیۃ اللہ العظمیٰ صافی گلپائگانی، ''نگرشی بر فلسفہ و عرفان''، صفحہ 32، انتشارات دلیل ما، 1399۔

متاخرین کے بارے علامہ طباطبائی کی رائے

مسلم فلاسفہ کو چھوڑ کر باقی متاخرین کے بارے بھی علامہ طباطبائی کی رائے اچھی نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مدارس کا نظام ایسا ہے کہ کوئی شخص قرآن کو چھوئے بنا بھی مجتہد بن سکتا ہے۔[1] یاد رہے، علامہ خود سائنس کی تعلیم حاصل کئے بنا فلسفی بنے بیٹھے تھے اور سائنس کے موضوعات، حرکت، روشنی، ماہیتِ اشیاء، وغیرہ، پر غلط سلط باتیں لکھتے رہتے تھے۔

[1] علامہ طباطبائی، ''تفسیر المیزان''، جلد 5، صفحہ 276، منشورات اسماعیلیان۔

21. فلسفہ و عرفان کا فتنہ –آیۃ اللہ العظمیٰ صافی گلپائگانی

مامون عباسی (متوفی 833ء) کے زمانے سے یونانیوں کا فلسفہ مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہوا تو اسلام کی نصوص، بالخصوص اصولِ دین، فلسفیوں کی تاویلات کی زد پر آ گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی آراء کے مطابق نصوص کے معنی بدلے۔ شریعت کی نصوص کے ظاہری معانی سے آزاد ہو کر فلسفے، اور حتیٰ کہ (فرسودہ یونانی) طبیعیات، کی رو سے آزادانہ تشریحات کرنے کا رواج ہو گیا تو انہوں نے لوگوں کو نصوص کے حقیقی معنوں سے دور کر دیا۔ توحید و صفاتِ الٰہیہ اور حادث و قدیم اور خالق و مخلوق وغیرہ کے معنوں میں انہوں نے ان چیزوں کو داخل کیا جو ظواہر سے میل نہیں کھاتیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مذہب کو ظن و گمان اور مفروضوں پر استوار کیا اور اس کی ایسی تشریح کی جو دین کے مالک اور مفسرینِ برحقؑ کی منشاء کے خلاف تھی۔ انہوں نے اعلیٰ معارف کی تفسیر انبیاءؑ کے راستے سے ہٹ کر کی۔ انکے اذہان آسمانی ہدایت کے نور سے روشن نہیں ہوئے تھے۔ پس وہ ذہنی طور پر بے لگام ہو گئے اور اپنی مرضی کی راہوں پر چل پڑے۔ وہ ایسی اصطلاحات لائے جو قرآن کی اصطلاحات سے موافق نہیں ہیں۔ وہ ایجاب، حلول، اتحاد اور وحدت الوجود جیسی اصطلاحوں میں پڑ گئے۔ انہوں نے حادث و قدیم کے تعلق کو مخلوق و خالق کے بجائے معلول و علت کے تعلق کی طرح قرار دیا، جبکہ ان میں واضح فرق ہے۔ کہاں خالق و مخلوق اور کہاں علت و معلول؟ دوسری اصطلاح سے وہ مفہوم نہیں نکلتا جو پہلی اصطلاح سے سمجھ میں آتا ہے، جو دوسری کا مطلب ہے وہ پہلی کا نہیں ہے۔ دونوں راستے ایک نہیں اور نہ ہی

ایک مقصد تک پہنچاتے ہیں۔ علت پہلی، دوسری،۔۔ ہو سکتی ہے لیکن خالق پہلا، دوسرا اور تیسرا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معلول بھی پہلا، دوسرا، تیسرا۔۔۔ ہو سکتا ہے لیکن مخلوق میں ایسا اول، دوم، سوم کا سلسلہ نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض احادیث میں "اول ما خلق الله نوری" آیا ہے، لیکن اس سے مراد وہ نہیں کہ جیسے پہلے معلول کو دوسرے کی علت، اور دوسرے کو تیسرے کی علت سمجھا جائے ویسے ہی پہلی مخلوق دوسری کی خالق ہو۔ سب مخلوقات، چاہے کچھ پہلے خلق ہوئی ہوں اور کچھ بعد میں، انکا خالق ایک ہی ہے اور سب کو اسی ایک سے خلقت کی نسبت ہے۔ یہ ایسا تعلق نہیں جیسے معلولِ ثانی جو کہ علتِ ثالثہ ہو وہ معلولِ اول و علتِ ثانیہ کا معلول ہو۔

فلسفیوں کی کتابیں، اور ان میں جو کچھ بظاہر آسمانی وحی سے مطابقت رکھنے والا مواد پایا جاتا ہے وہ بھی وحی کے ساتھ مکمل طور پر متفق نہیں، نہ وہ کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ اس میں خشک و تر، حق و باطل مخلوط ہے۔ بعض مقامات پر وہ انبیاءؑ سے متفق ہیں اور بعض جگہوں پر انکا اختلاف ہے۔ خصوصاً ماضی قدیم کے (یونانی) لوگ، جو خدا تعالیٰ کے رسولوں کی لائی ہوئی ہدایت پر رسمی حد تک یقین رکھتے اور عمل کرتے تھے مگر ان کے اذہان اس رہنمائی سے خالی ہو چکے تھے اور انبیاءؑ کی رہنمائی کے بغیر عقل گمراہ ہو جاتی ہے۔ جو (مسلم) فلاسفہ ان کے بعد آئے وہ ان کے راستے پر چلے اور ان کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ تاہم انہوں نے ان مفروضات کی کتاب وسنت سے تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گویا وہ اسلام کے معارف کو معنوی طور پر ان مفاہیم کے قریب لانا چاہتے تھے جنہیں ان کی عقل درست

سمجھ رہی تھی۔ لہٰذا ان میں سے صرف چند ہی خطاؤں، لغزشوں اور پھسلنے سے محفوظ رہے۔اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ معاصرین میں سے مشہور ترین متکلمین نے معادِ جسمانی کے مسئلہ پر معروف مسلم فلسفیوں کی رائے کو سختی سے مسترد کیا، یہاں تک کہ ان کو گمراہی کا شکار قرار دیا کہ خدا ہمیں اس سے بچائے۔ حوالے کے لیے ملا محمد اسماعیل مازندرانی کا قرآن کی اس آیت "وكان عرشه على الماء"[1] کی تفسیر میں لکھا گیا رسالہ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ اپنی جگہ ایک انحراف ہے کہ ان حضرات نے ان امور پر بحث کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا کہ جن کے بارے میں بات کرنا نا صرف واجب نہیں ہے، بلکہ منع کیا گیا ہے۔ کیا وہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں جو ارسطو، افلاطون، سقراط، رواقیوں اور مشائیوں، یعنی فارابی اور ابنِ سینا، کے عقائد کو اپنائے ہوئے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو محمدؐ وآلِ محمدؑ کی تعلیمات کو اپنائے ہوئے ہیں اور انکی سیرت پر چلتے ہیں؟ ہم کسی شخص کو پہلے یا دوسرے گروہ کا حصہ قرار نہیں دے رہے اور امید کرتے ہیں کہ مسلمان فلسفی دوسرے گروہ میں شمار ہوں۔ ان کی آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر ہی چھوڑنا چاہیے۔

جن لوگوں نے اپنی بنیاد نصوص کی تاویل پر رکھی اور اپنی پسند اور تخیل کے مطابق ان کو پھیر دیا، ان میں سے عرفاء اور صوفیوں کے فرقے سے پہنچنے والا نقصان سب سے زیادہ اور

---

[1] سورہ ہود، آیت 7

انکی تاویلیں سب سے بری ہیں۔ وہ اصولِ دین اور فروعات کو کھیل بنا لیتے ہیں۔ ان کو اپنی فاسد آراء سے تطبیق دیتے ہیں اور اپنے برے اعمال کی توجیہ کرتے ہیں۔ انکے اقوال پوچ اور انکے نظریات باطل ہیں۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر لیتے ہیں۔ صریح نصوص کے خلاف سیر و سلوک اور بیعت کے سلسلوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔ انکی تاویلات مکڑی کے جالے سے زیادہ ناپائیدار ہیں۔ ان کی چند کتابیں، ان کے بڑوں کی تاریخ اور ان کے اشعار پڑھ لینا ہی اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہو گا کہ حقیقی معرفت اور شریعت سے انکا فاصلہ زمین تا آسمان ہے۔ خدا مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ ان کی گمراہی کی وجہ فضول توہمات میں مگن ہونا اور قرآن و اہلبیتؑ سے دوری ہے۔

ان گروہوں میں سب سے زیادہ تباہ کن وہ ہے جس نے فرسودہ یونانی فلسفے اور عرفان کا ملغوبہ تیار کر لیا ہے، گویا کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا!

اگر کوئی جاننا چاہے کہ صوفیوں کا اور انکے پیروکاروں کا راستہ کیا ہے تو وہ ملا عبدالرزاق کاشانی کی تفسیر کو دیکھے کہ اس میں اس قسم کی تاویلات بہت مل جائیں گی۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ ''وانظر الی حمارک''[1] کی تفسیر میں ''حمار'' سے مراد حضرت عزیرؑ کو لیا ہے، ''صفا و مروہ'' کو قلب اور نفس قرار دیا ہے۔[2] جہاں تک سورہ کہف کی آیت 82 میں

---

[1] سورہ بقرہ، آیت 259۔

[2] ملاحظہ ہو جلد 1 کا صفحہ 100 اور 147۔

دو یتیم بچوں کا ذکر ہے تو انہیں عقلِ نظری اور عقلِ عملی قرار دیا ہے۔ سورہ نساء کی پہلی آیت میں ''نفس واحدہ'' کی تفسیر نفسِ ناطقہ اور ''زوجہا'' کی تفسیر نفسِ حیوانی کر دی ہے۔ ان کی باتوں میں لغو تاویلیں بہت ملتی ہیں، جنہیں ابنِ عربی کی فصوص الحکم وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ بیان کرنے میں دلچسپی نہیں ہے کہ ہمارا مقصد صرف اس فاسد راستے کا مختصر تعارف پیش کرنا تھا۔[1]

[1] آیۃ اللہ العظمیٰ صافی گلپائگانی، ''لمحاتٌ فی الکتاب والحدیث والمذہب''، جلد 3، صفحات 388 تا 392، قم، 2012ء۔

22. علامہ حسن زادہ آملی کے بارے میں غلو کی حقیقت۔ ڈاکٹر حمید رضانیا کی

خواتین و حضرات! السلام علیکم، جیسا کہ آپ نے خبروں میں سنا، دو دن پہلے، یعنی 25 ستمبر 2021ء کو، علامہ حسن زادہ آملی، ایک نامور شیعہ عالم، مسلم فلسفے اور عرفانِ نظری کے شارح و مدرس، 93 سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ اس موقع پر سمجھتا ہوں کہ ان کے بارے کچھ اہم نکات آپکی خدمت میں پیش کروں۔

پہلا نکتہ، جیسا کہ شروع میں کہا، حسن زادہ آملی، ابنِ عربی کے خیالات والے عرفانِ نظری اور ایرانی مدارس میں رائج مسلم فلسفے کے شارحین میں سے ہیں۔ انکی شہرت و مہارت فلسفے سے زیادہ عرفانِ نظری میں نمایاں ہے۔ (قدیم) فلسفے میں ابنِ سینا (متوفی 1037ء) کی کتابوں شفا اور اشارات، کہ جو فلسفہ مشاء کی دو اہم کتب ہیں، پر انکی تصحیح اور تشریح کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یا ابن سینا کی اشارات کے آخری تین ابواب، جو مقاماتِ عارفین کے، میں ہے، کا ترجمہ اور شرح کیا ہے۔ یا فارابی کی کتاب فصوص الحکم، جو ابنِ عربی کی فصوص الحکم کے علاوہ ہے اور فلسفے پر ہے، کا نصوص الحکم کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ اگر ان تراجم و شروح پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس راستے میں حسن زادہ آملی صاحب نے بہت محنت اور وقت صَرف کیا ہے۔ مذکورہ کتب کے علاوہ فلسفے کے مختلف موضوعات پر بھی کتابیں اور رسائل لکھے ہیں۔ البتہ ان میں دوسرے فلسفیوں کی لمبی لمبی

عبارتوں کو ہو بہو نقل کر کے صفحات کی تعداد بڑھائی ہے جو تحقیق کے جدید معیارات سے میل نہیں کھاتا۔[1] یہ انداز انکی اکثر کتابوں میں نمایاں ہے، جو مختلف مذہبی و قدیمی موضوعات پر لکھیں۔ یعنی جب حسن زادہ آملی کی کتابوں کو دیکھیں تو اکثر صفحات نقلِ قول پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ تحریر کی خامی ہوتی ہے، اگرچہ شاید وہ اصل متن سے استناد کی نیت سے ایسا کرتے ہوں۔

عرفانِ نظری میں انہوں نے اس میدان کی بنیادی کتابوں کی تصحیح و تشریح کی ہے۔ ابنِ عربی کی فصوص الحکم پر شرح (ممد الھمم) لکھی ہے۔ شرحِ قیصری پر بھی تعلیقہ لکھا ہے۔ یا مثلاً عرفانِ نظری کی ایک بنیادی کتاب، ابنِ ترکہ کی تمہید القواعد کی شرح لکھی ہے۔ یا جیسے ابن فناری کی مصباح الانس پر ایک تعلیقہ لکھا ہے، جو شاید مکمل شائع نہیں ہوا۔ یہ بعنوانِ مشکاۃ القدس علی مصباح الانس شائع ہوا ہے۔ حسن زادہ آملی نے ان دو شعبوں، کہ جو شیعی مدارس میں چنداں مقبول نہیں، اور دوسرے رائج علومِ دینی، جیسے فقہ، اصولِ فقہ، رجال، ادبیاتِ عرب اور بعض دینی متون کی تفسیر کے علاوہ متروک علوم کی بعض شاخوں پر کام کیا، کہ جو آجکل قدر و قیمت کھو چکے ہیں۔ لیکن حسن زادہ نے کافی توانائی ان چیزوں پر خرچ کی اور فرسودہ علوم مثلاً قدیم ریاضی، قدیم علمِ نجوم اور قدیم طب میں جتنا ممکن تھا مہارت حاصل کی اور کچھ کتابیں لکھیں۔

---

[1] عرضِ مترجم: صرف حوالہ دینا کافی تھا کیونکہ آجکل اصل کتاب آسانی سے مل جاتی ہے۔

قدیم ریاضیات کے بارے انہوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے کچھ کی مثال دوں گا۔ جیسے مانالاؤس کی کتاب اکر مانالاؤس (Sphaerica Menelaos) اور ثاذوسیوس کی کتاب اکر ثاذوسیوس پر خواجہ نصیر الدین طوسی (متوفی 1274ء) کی شرح کی اصلاح کی۔ ان کتابوں کا موضوع مثلثاتِ کروی، یعنی (spherical triangles) ہے۔ خواجہ طوسی نے ان پر شرح لکھی تھی۔ مانالاؤس (متوفی 140ء) مصر کے شہر سکندریہ میں رہنے والا ایک یونانی ریاضی دان تھا۔[1] یا مثلاً اکر ثاذوسیوس کہ جسے خواجہ طوسی نے جمع کیا، یونانی ریاضی دان ثاذوسیوس کی جیومیٹری پر ہے اور حسن زادہ آملی نے اس کی تصحیح (editing) کر کے حاشیہ لگایا ہے۔ یا مثلاً حسن زادہ آملی صاحب کی ایک کتاب ہے تصحیح و تعلیق تحریرِ اقلیدس، جو یونانی ریاضی دان اقلیدس (Euclid) کی کتاب (Elements) کی تصحیح (editing) ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرسودہ ریاضی پر خود بھی کچھ کتابچے لکھے ہیں، جیسے رسالہ ظل ہے۔ قدیم ریاضی میں (tangent) کو ظل کہا جاتا تھا، جدید ریاضی کی بعض اصطلاحات ماضی میں کسی اور نام سے استعمال ہوتی تھیں۔ سادہ سے مسائل کے حل کے لیے بہت پیچیدہ کلیے بنائے گئے تھے، جنہیں اب آسان بنالیا گیا ہے۔ قدیم علمِ نجوم میں بھی حسن زادہ آملی صاحب نے زیج کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ زیج ایک ایسے جدول (table) کا نام تھا جس میں مختلف

---

[1] عرضِ مترجم: اور خواجہ طوسی کو وفات پائے سات صدیاں ہو چکی ہیں۔ پلوں کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا ہے۔

اوقات میں سیاروں، ستاروں اور کواکب کا مقام لکھا جاتا تھا۔ مثلاً انہوں نے شرحِ زیجِ بہادری لکھی، اور شرح بیرجندی بر زیجِ الغ بیگ کی اصلاح (editing) کر کے حاشیہ لگایا۔ متروکہ علمِ نجوم (ancient astronomy) پر ان کے کام کی یہ کچھ مثالیں تھیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر حسن زادہ آملی کی اس ساری محنت و مشقت پر نظر ڈالی جائے جو انہوں نے فرسودہ ریاضی اور متروکہ علمِ نجوم کو سیکھنے، پڑھانے اور لکھنے میں اٹھائی، تو کچھ لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ حسن زادہ آملی ریاضی اور نجوم میں کوئی بڑی شخصیت ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں بہت سے قصے گھڑے گئے، جو حسن زادہ آملی صاحب کے مریدوں میں مشہور ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ باوجود اس ساری مشقت کے جو انہوں نے متروکہ ریاضی کو سیکھنے میں اٹھائی، ان چیزوں کی موجودہ علمی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں، اور اگر کوئی ریاضی یا علمِ نجوم کی تاریخ کی طرف مائل ہو تو اس کے لیے ہو سکتا ہے کہ یہ کتابیں دلچسپ ہوں، البتہ یہ کوئی مفید کام نہیں۔ یوں سمجھئے کہ کیا جدید ماہرینِ طبیعیات، جیسے آئن سٹائن، ہائزنبرگ، شوڈنگر، بوہر، پلانک وغیرہ ارسطو کی طبیعیات کو پڑھنا اور اس پر کتاب لکھنا چاہیں گے؟ واضح ہے کہ وہ ایسا (لایعنی کام) نہیں کریں گے۔ کیونکہ جدید فزکس کی ماہیت مکمل طور پر ارسطو کی فزکس سے مختلف ہے۔ قدیم اور جدید علمِ نجوم میں بھی اسی

طرح فرق ہے۔[1] متروکہ علمِ نجوم کی بہت سی بحثیں جدید ماہرینِ فلکیات کے لیے مضحکہ خیز ہیں۔

ریاضی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ جدید ریاضی اور فرسودہ ریاضی بہت حد تک مختلف ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ حسن زادہ آملی ریاضی اور علمِ نجوم کے علمی قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے۔ بالفاظ دیگر، وہ شروع سے ہی جدید علم کی ٹرین پر سوار نہیں ہوئے اور اس کی بنیادوں سے بھی واقف نہیں تھے۔ انکے مرید اور شاگرد انکے علم نجوم و ریاضی بارے جو بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، بے بنیاد ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ جعلی فضائل تاریخی مایوسیوں اور ناکامی کاردِ عمل ہیں جو مسلم دنیامیں جدید مغرب کے مقابل پیدا ہونے والے احساسِ کمتری کا نتیجہ ہیں، جو ایک اعتبار سے ہم پر استعماری غلبے کی نفسیاتی باقیات ہیں جن سے خود فریبی (wishful thinking) جیساشناختی بحران پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ جیسا خود کو دیکھنا چاہتے ہیں، ویسا ہی خود کو فرض کر لیتے ہیں، کہ گویا ویسے ہی ہیں۔ اور یہی فکری تعصب اس بات کا سبب بنا ہے کہ حسن زادہ آملی صاحب کی ریاضی میں مہارت کی داستانیں بنائی گئیں۔ کہ مثلاً فلاں جگہ ایک یونیورسٹی کے طالب علم سے حسن زادہ کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے اس طالبِ علم کو مشکل سوالات حل کر کے دیئے، اور وہ

---

[1] عرض مترجم: نیوٹن (متوفی 1727ء) نے علمِ نجوم اور طبیعیات میں تعلق کو دریافت کیا تھا اور وہاں سے جدید علمِ نجوم کی بنیاد پڑی۔

یونیورسٹی کالڑ کا مولانا صاحب کی ریاضی میں مہارت سے بہت متاثر ہوا۔اس قسم کی جھوٹی کہانیاں کہ جو انکے شاگردوں اور مریدوں نے بنائیں،اسی احساسِ کمتری کا اثر لگتی ہیں۔

تیسری بات جو کہنا چاہوں گا یہ ہے کہ اگر ہم جدید انسان کی تعریف یوں کریں کہ وہ جدید دور میں زندگی گزارتا ہے اور اپنی عقل کو استعمال کرتا ہے،تو اس اعتبار سے حسن زادہ ایک عقب ماندہ شخص ہیں۔ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ حتیٰ اپنے علمی سفر میں قدیم اور جدید دور کے سنگم پر بھی نہیں پہنچ پائے ہیں۔انہوں نے جدید دنیا کے سوالات کا سامنا تک نہیں کیا۔یہ ان کی کوئی خوبی شمار نہیں ہو سکتی۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ انکے شاگردوں نے ان کی کچھ کرامات جیسے چشمِ برزخی رکھنا، طے الارض کرنا وغیرہ، مشہور کی ہیں۔ حتیٰ خود حسن زادہ آملی نے اپنی کتابوں جیسے انسان در عرف عرفان، یاہزار و یک کلمہ،میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ان سنی سنائی باتوں کی تائید یا تردید کا ہمارے پاس کوئی طریقہ نہیں ہے۔ حتیٰ حسن زادہ آملی کے مریدوں کے لیے بھی ان کی تصدیق کرنا ناممکن ہے، کیونکہ یہ دعاوی شخصی (private)ہوتے ہیں اور کوئی بین الاذہانی معاملہ نہیں ہوتے۔

لمحات

في الكتاب والحديث والمذهب



الفقيه الكبير
المرجع الديني سماحة آية الله العظمى
الشيخ لطف الله الصافي الگلپايگاني دام ظله الوارف

الجزء الثالث

فتنة الفلسفة والفلاسفة

لمّا شاع من عصر المأمون فلسفة اليونانيين بين المسلمين صارت نصوص الإسلام سيّما في أصول الدين غرضاً لتأويلات المتفلسفين فصرفوا النصوص على آرائهم وعدّ من الثقافة الخروج من نصوص الشريعة وظواهرها وتأويلها على ما يوافق ما حرروها في الفلسفة حتى في الطبيعيات فبعدوا وأبعدوا الناس عن مفاهيم نصوص الدين، في التوحيد والصفات ومفهوم الحدوث والقدم والخالق والمخلوق وغيرها، فأولوها بما لا يوافق ظواهرها فبنوا دينهم على الظنون والزعوم وفسروه بما لا يرتضيه صاحبه وأهل تفسيره فقرروا المعارف العالية على الأسس التي قرّرها الذين لم يسلكوا مسلك الأنبياء، ولم يستضيئوا من نور هدايتهم السماوي فاستقلوا بعقولهم ومشوا في مذاهبهم وجاءوا بإصطلاحات التي لا توافق اصطلاحات القرآن الكريم ووقعوا في القول بالإيجاب والحلول والاتحاد ووحدة الوجود، وفسروا ربط الحادث بالقديم كربط المعلول بالعلّة لا كربط المخلوق بالخالق مع الفرق الواضح بين

الاصطلاحين، فكم فرق بين الخالق والمخلوق والعلّة والمعلول؟ لا يدرك بالاصطلاح الثاني ما يدرك بالاصطلاح الأول، وما يدرك من الثاني لا يدرك من الأول، لا يتّحد الطريقان ولا ينتهيان إلى مقصد واحد والعلّة يعبّرون عنها بالعلّة الأولى والثانية و... وأما الخالق فلا يعبّر عنه بالخالق الأوّل والثاني وكذا المعلول الأوّل والثاني والثالث.. ولا يقال المخلوق الأول والثاني والثالث[1]. فجميع المخلوقات وإن وقعت خلقة بعضهم في طول خلقة البعض الآخر مخلوقون لخالق واحد نسبة الجميع إليه سواء لا كالمعلول الثاني، والعلّة الثالثة الذي هو معلول للمعلول الأوّل والعلّة الثانية و. و..

وكتب الفلاسفة مع ما يوجد فيها ممّا يوافق وحي السماء لا يوافق جميع مباحثها مع الوحي وما هو ثابت بالكتاب والسنّة ففيها الغثّ والسمين والحقّ والباطل، وما يتّفق مع ما جاء به الأنبياء وما يخالفه وذلك لأنّهم سيّما القدماء منهم اقتنعوا واستغنوا بمنسوجاتهم عمّا جاء به رسل الله تعالى واستقلّوا بعقولهم عن هدايتهم فيما لا يهتدي العقل إليه لولا هداية الأنبياء، والذين جاؤا بعدهم سلكوا مسالكهم واتبعوا طريقهم غير انهم سعوا بعد ما أثبتوا عليه في المسائل تطبيق الكتاب والسنّة عليه فكأنّهم أرادوا أن ينزّهوا المشرّع عمّا وصل إليه عقولهم، ولذا لم يأمنوا عن الأخطاء والعثرة والزلّة إلّا القليل منهم فنرى إن إثنان من أشهر حكماء المعاصرين بالغا في تخطئة اثنين من مشاهير الفلاسفة في مسألة المعاد

---

(١) نعم جاء في بعض الأحاديث أوّل ما خلق الله... ولكن المراد منه ليس ما يريد هؤلاء من المعلول الأوّل المسمّى بالعلّة الثانية والعقل الثاني والمعلول الثاني للعلّة الثانية و.و..

الجسماني حتى رماهما بما نعوذ بالله منه[١].

هذا مع انهم تكلّفوا الكلام فيما لم يكلّفوا بالتكلّف فيه، بل نهوا عنه.

فهل هؤلاء يسلكون سبيل أرسطو وأفلاطون وسقراط والرواقيين والمشائيين، والفارابي وابن سينا وغيرهم؟ أم هم المهتدون بهدي محمد وأهل بيته صلّى الله عليهم، والسالكون سبيلهم، نحن لا نحكم على الجميع على إنهم من الطائفة الأولى أو الثانية ونرجو أن يكون جلّ فلاسفة المسلمين من الثانية وأما حسابهم فعلى الله تعالى.

(١) راجع رسالة الخاجوئي محمد إسماعيل المازندراني في تفسير قوله تعالى: وكان عرشه على الماء.

فتنة العرفاء والمتصوفة

ومن الذين بنوا أمرهم على تأويل النصوص وصرفها على ما يوافق أهوائهم وخيالاتهم وأعظمهم ضرراً وأقبحهم تأويلاً الطائفة المتسمّية بالعرفاء والمتصوفة، الذين لعبوا بأصول الدين وفروعه وطبّقوها على آرائهم الفاسدة وصحّحوا بها أعمالهم الخبيثة، لهم مقالات واهية وكلمات باطلة حرّموا الحلال وحلّلوا الحرام، وجاءوا مع إختلافهم في سيرهم وسلوكهم وسلاسلهم بما يخالف صريح النصوص، وتأويلات أوهن من بيوت العنكبوت وحسبك في ذلك أن تطالع بعض كتبهم وتاريخ رؤسائهم وأشعارهم حتى تعرف إنّهم من العرفان الحقيقي ومن الشرع أبعد من الأرض عن السماء، أعاذ الله المسلمين من شرورهم فلم يتقهقروا إلّا لإشتغالهم بترّهات هؤلاء وإنصرافهم عن التمسّك بالثقلين.

وأكثر ضرراً من هاتين الطائفتين على أنفسهم وعلى غيرهم من خلط ما تسمّيه هؤلاء بالعرفان بفلسفة اليونان فزاد في الطنبور نغمة أخرى.

وإن شئت أن تعرف ما عليه المتصوفة ومن سلك مسالكهم فراجع تفسير ملا عبدالرزاق القاساني تجد فيه كثيراً من هذه التأويلات، فإنّه في مثل الآية الكريمة: ﴿**وانظر الى حمارك**﴾[١] تأول الحمار بالعزير النبي[٢] والصفا والمروة بالقلب والنفس[٣]، واما الجدار فكان لغلامين يتيمين[٤] بالعقل النظري والعقل العلمي، وفي خلقكم من نفس واحدة، تأول النفس بالنفس الناطقة، وفي: خلق منها زوجها تأول الزوج بالنفس الحيوانية، والتأويلات الفاسدة في كلماتهم كثيرة جداً، فراجع الفصوص وغيرها ولا يهمّنا ذكر أكثر من ذلك، والغرض الإشارة إلى فساد الطريقة.

---

(١) البقرة: الآية ٢٥٩.

(٢) تفسير ملّا عبدالرزّاق: ج١ ص١٤٧.

(٣) نفس المصدر: ص١٠٠.

(٤) في سورة الكهف الآيه ٨٢: ﴿وأما الجدار فكان لغلامين يتيمَين في المدينة﴾.